بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

مقدّمہ

تمہید

میں اس سے پہلے کہ تفسیرِ صدیقی یا اُصولِ تفسیر کے متعلق کچھ لکھوں ، پہلے ان حضرات کا نام اور کام لکھتا ہوں جنھوں نے قرآن شریف کی خدمت کی مگر سورۂ الم نشرح کی تفسیر، بطور تمثیل کے بیان کروں گا۔

شرحِ صدرِ محمدیؐ کے بیان میں فقیر محمد عبدالقدیر صدیقی کے خیال میں ایک مثال ، مرئی و نمایاں ہورہی ہے کہ رسولِ خداﷺ کے سینۂ معارفِ گنجینہ سے ایک عظیم الشان زوردار آبشار نکل رہا ہے ۔ یہ آبشار کہیں آواز بن کر قاریوں کے گلے سے قرآن کی صورت میں نکلتا ہے ، کہیں برق بن کر عاشقوں کے دلوں پر گرتا ہے ، کہیں حرارت بن کر ان کے دلوں کو سوختہ کردیتا ہے اور ان کی آہ و بکا کا باعث بھی ہوتا ہے ، کہیں حرکت بن کر جاں نثارانِ محمدیؐ کے زور و قوت میں ہویدا ہوتا ہے ، انھیں جانبازی پر برانگیختہ کرتا اور اعمالِ شاقہ کو آسان کردیتا ہے اور کہیں نہایت لطیف حرکت و افعال ، آواز میں ادائے محبوبانہ اور دلربائی و دلکشیِ معشوقانہ بنتا ہے اور لوگوں کے دلوں کو مسخر کرلیتا ہے ۔ یہی آبشار روشنی بن کر نمایاں ہوتا اور اہلِ علم کے دلوں کو منور کردیتا ہے اور کہیں حیاتِ جاودانی بن کر باقی باللہ افراد کو زندۂ جاوید کردیتا ہے ، کہیں بردِ یقین و نورِ سکینہ اور اطمینانِ قلب بن کر بندگانِ خاص کے لئے باعثِ تسکینِ خاطر ہوتا ہے اور کہیں عامتہ المسلمین کے لئے سرمایہ طہارت و لطافت ہوتا ہے ۔ اس آبشار کا پانی ایک بحیرہ یا ساگر میں جمع ہوتا ہے ۔ اس کے ایک جانب بند باندھا گیا ہے جس میں کئی دروازے یا در ہیں جو قیامت تک کبھی بند نہ ہونے والے ہیں ، ہر ایک دروازے یا در پر کتبے لکھے ہوئے ہیں ۔

ایک در پر یہ کتبہ ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ؛ ذرا کچھ باریک خط میں اِقْرَءُوْا الْقُرْاٰنَ بِلُحُوْنِ الْعَرَبِ کا بھی کتبہ ہے۔ یہ درقرآن کا ہے، اس کے پاس کئی تخت بچھے ہوئے ہیں، بعض بڑے ہیں بعض چھوٹے۔ ایک تخت پر جامع القرآن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جلوہ گر ہیں جنھوں نے اپنے زمانہ میں تمام اصحاب سے لے کر ایک جگہ جملہ مکتوباتِ قرآنی کو جمع کردیا۔ ایک تخت پر جامعِ دوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں، آپ نے صدیق اکبرؓ کے جمع کردہ صحیفہ کو سات مصاحف کی صورت میں لکھوا کر سات شہروں میں روانہ کردیا۔ ایک اور تخت پر حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ایک پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ، ایک پر حضرت زیدؓ بن ثابت رضی اللہ عنہ، اور ایک پر ابیؓ بن کعب بیٹھے ہوئے ہیں۔ پاس ہی دوسرے چھوٹے چھوٹے تخت بچھے ہوئے ہیں جن میں سے ایک پر عاصمؔ کوفی مع اپنے دونوں شاگردوں شعبہؔ و حفصؔ کے بیٹھے ہوئے ہیں، ایک پر نافعؔ مدنی مع اپنے دونوں شاگردوں قالونؔ اور ورشؔ کے، ایک پر ابوعمرو بصری اپنے دونوں شاگردوں دوریؔ بصری اور سوسیؔ کے ساتھ، ایک پر ابنؔ کثیر مکی مع اپنے دو شاگردوں بزیؔ اور قنبلؔ کے، ایک پر ابن عامرؔ شامی مع اپنے دو شاگردوں ھشام اور ابنؔ ذکوان کے اور ایک پر حمزہؔ کوفی مع اپنے دو شاگردوں خلفؔ اور خلادؔ کے اور ایک پر علیؔ کسائی کوفی مع اپنے دو شاگردوں ابوؔ حارث لیث اور دوریؔ علی کے بیٹھے ہیں۔

احادیثِ نبویؐ سے ثابت ہے کہ حضرت جبرئیلؑ امین خصوصاً ماہِ رمضان میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو پورا قرآن سناتے اور حضرتؐ سے سنتے، ممکن ہے کہ جبرئیلؑ نے مختلف اوقات میں مختلف طور سے مختلف قبائل کے محاوروں کے مطابق قرآن پڑھا ہو اور حضرتؐ نے سنا ہو مثلاً کبھی رِضْوَانٌ اور کبھی رُضْوَانٌ۔ کبھی اَنَّ پڑھا ہو اور کبھی اِنَّ، کبھی سَدًّا کبھی سُدًّا۔ ایک دفعہ ایک صاحب نے ایک لفظ پڑھا اور دوسرے صاحب نے دوسرا لفظ، دونوں اصحاب لڑتے ہوئے دربارِ رسالت میں پہنچے، اور آپؐ نے دونوں کی تصدیق کی، فرمایا: اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ ؛ اپنے اپنے محاوروں کے مطابق کسی نے زبر پڑھا، کسی نے پیش، جیسے کسی نے سَدًّا پڑھا اور کسی نے سُدًّا۔ غرض ہر ایک قبیلہ کے شخص کو اس کی زبان کے مطابق قرآن پڑھنے میں سہولت ہوگئی۔

ایک دوسرے در پر حسبِ ذیل کتبہ کندہ ہے:

اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَکُمْ اور خفی خط میں اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ کا بھی کتبہ ہے۔ یہ در، دعا کرنے والوں کا ہے۔ رسولِ خداﷺ نے کونسی دعا ہے کہ اپنی اُمّت کے لئے نہیں کی۔

قرآن اور حدیثوں پر غور کرو کہ توحید ان میں ہے۔ تہذیبِ نفس کی دعائیں ان میں ہیں غرض کہ ہر ہر مسئلہ کے متعلق احادیثِ نبوی میں مواد ملتا ہے۔ احادیث نبوی کی دعاوں کو حضرت جزری رحمتہ اللہ علیہ نے ''حصن حصین'' میں ایک جگہ جمع کردیا ہے۔ ''حصن حصین'' میں ہر وقت، ہر کام اور ضرورت کی دعائیں الگ الگ لکھی ہوئی ہیں۔ حضرت جزری رحمتہ اللہ علیہ اپنی ''حصن حصین'' کے ساتھ ایک چھوٹے تخت پر تشریف رکھتے ہیں، ایک اور مجموعہ ادعیہ نبویہ ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ نے تالیف کیا ہے جس کا نام ''حزب اعظم'' ہے، اس میں قرآن شریف کی دعائیں ہیں، حدیث شریف کی بھی ہیں اور درود بھی اس میں ہے، علی بن سلطان ملا علی قاری رحمتہ اللہ علیہ مع ''حزب اعظم'' ایک چھوٹے تخت پر بیٹھے ہوئے ہیں۔

ایک اور چھوٹے تخت پر امام جزولی رحمتہ اللہ علیہ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''دلائل الخیرات'' ہے جس میں صلوٰۃ وسلام اور اہم ادعیہ ہیں ۔ ان چھوٹے تختوں کے پاس چند بڑے تخت بھی ہیں ، ان میں سے ایک تخت پر حضرت امام علی بن حسین زین العابدین رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں ۔ اور آپ کے دستِ مبارک میں ''صحیفہ کاملہ'' ہے ۔ جس کو نہایت دلگداز آواز سے پڑھ رہے ہیں ، ایک اور تخت پر حضرت سیدی محی الدین عبدالقادر جیلانی تشریف رکھتے ہیں ، اور آپ کے دستِ مبارک میں ''فیوضاتِ قادریہ'' ہے ۔ ایک اور تخت پر شیخ محی الدین ابن عربیؒ متمکن ہیں ، ان کے دستِ مبارک میں بہت سی ادعیہ اور صلوٰۃ وسلام کا مجموعہ ہے ۔ ایک اور تخت پر سیدی ابوالحسن علی شاذلیؒ ہیں ، ان کے دستِ مبارک میں ''الانوار القدسیہ'' ہے جس میں ''حزب البحر''۔ ''حزب النصر'' وغیرہ احزاب ہیں ۔

ایک اور در پر یہ کتبہ ہے :

اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ مِنْ شَرِّمَا خَلَقَ ۔ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ؛

اس در پر یہ کندہ ہے : کَالَّذِیْ یَتَخَبَّطُہُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؛ یہ در ، استعاذہ ، تعویذات اور عملیات کا در ہے ۔ اس کے پاس ایک تخت پر حضرت عمرؓ بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور ایک پر حضرت علی ابن الی طالب رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں اور ایک پر حضرت ابوالحسن علی شاذلیؒ اور ان کے ہاتھ میں حزب البحر وغیرہ ہے ۔ ایک پر بونیؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''شمس المعارف'' ہے ۔ ایک پر حضرت سید غوث گوالیاریؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''جواہرِ خمسہ'' ہے ۔ ایک پر حضرت شاہ کلیم اللہؒ جہاں آبادی ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''مرقع شریف'' ہے ۔

آگے ایک اور در ہے اس پر یہ کتبہ ہے :

وَلَا تَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ ۔ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗ اِلَّا اللّٰہُ ۔ وَالرَّاسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّابِہٖ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا وَمَایَذَّکَّرُ اِلَّا اُولُوالْاَلْبَابِ ۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰہُ قُرْاٰنًا عَرَبِیًّا ۔ یہ در مفسرین کا ہے ۔ اس در کے پاس ایک بڑے تخت پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما تشریف فرما ہیں ۔ ایک پر علامہ محمود زمخشریؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''تفسیرِ کشاف'' ہے ۔ ایک پر امام فخر الدین رازیؒ ہیں اور ان کے پاس ''تفسیرِ کبیر'' ہے ، اور ایک پر علامہ آلوسیؒ ہیں اور ان کے ساتھ ''روح المعانی'' ہے ۔ ایک پر قاضی ناصر الدین عبداللہ بن عمر بیضاویؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''انوار التنزیل'' ہے ، اور ایک پر محی السنتہ رکن الدین بن مسعود بغویؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''معالم'' ہے ۔ ایک اور تخت پر حضرت حافظ الدین نسفیؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''تفسیر مدارک'' ہے ۔ ایک تخت پر علاء الدین علی بن محمد المعروف بہ خازنؒ ہیں ، اور ان کے ہاتھ میں ''لباب التاویل'' ہے ۔ ایک پر امام جلال الدین سیوطیؒ ہیں جن کے پاس ایک بڑی تفسیر ''درمنثور'' رکھی ہے جس میں سب حدیثیں ہیں ، ان کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی تفسیر بھی ہے ۔ جس کے متعلق یہ بحث ہے کہ اس میں قرآن کے الفاظ زیادہ ہیں یا تفسیر کے ، اس کا نام ''تفسیرِ جلالین'' ہے ۔ یہیں ایک کنارے پر ایک فقیر کھڑا ہے جس نے اقتضائے زمانہ کا لحاظ کرتے ہوئے اُردو میں ایک عام فہم ''تفسیرِ صدیقی'' لکھی ہے اور اللہ سے دعا کر رہا ہے کہ اس کو شرفِ قبولیت عطا فرمائے اور اُمیدوار ہے کہ اس کو بھی ان تفاسیر کے تخت نشینوں کے پاس ہی ایک چھوٹا سا اسٹول مل جائے گا ۔

اس در کے قریب ہی ایک دوسرا در ہے اور اس پر یہ کتبہ ہے :

مَآ اٰتَاکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْہُ وَمَا نَھٰکُمْ عَنْہُ فَانْتَھُوْا ۔ اِذَاجَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا ؛ یہ درمحدثین کا ہے، یہاں سینکڑوں ہزاروں چھوٹے بڑے تخت بچھے ہیں ، ان میں سے چند تخت نشینوں کے نام یہ ہیں :

ایک تخت پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما ، ایک پر حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما ہیں ، جو حضرتؐ ہی کے زمانے میں احادیث کو جمع کرنا شروع کر چکے تھے ۔ ایک پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہیں ، اور ایک حجرہ ہے جس پر پردہ چھوٹا ہوا ہے ، اس میں حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں ۔ ایک تخت پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ہیں ، ایک پر امام مالک بن انسؒ ہیں اور آپ کے ہاتھ میں مؤطا شریف ہے ۔ ایک تخت پر امام محمد ابن الحسنؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ان کی ’’مؤطا‘‘ ہے ۔ ایک پر حضرت امام احمدؒ بن حنبل تشریف رکھتے ہیں ، ان کے ہاتھ میں ’’مسند احمد‘‘ ہے ۔ ایک پر امام محمد بن اسماعیلؒ بخاری ہیں جنھوں نے صحیح احادیث کا انتخاب کرکے ’’صحیح البخاری‘‘ میں جمع کیا ہے ۔ انہیں کے پاس ’’تاریخِ بخاری‘‘ بھی ہے جس میں تمام راویانِ حدیث کے حالات جمع کردیئے ہیں ایک تخت پر امام مسلمؒ ابن حجاج ہیں اور ان کے ہاتھ میں ان کی ’’صحیح مسلم‘‘ ہے ، ایک پر ابوعبداللہ محمد بن یزید ابن ماجہؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ’’سنن ابن ماجہ‘‘ ہے ۔ ایک پر ابوعبدالرحمٰن احمد نسائیؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ’’سنن نسائی‘‘ ہے اور ایک تخت پر امام محمد بن عیسٰی ترمذیؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ’’ترمذی شریف‘‘ ہے ۔ ایک پر سلیمان بن اشعث ابو داؤدؒ ہیں اور ان کے ہاتھ میں ’’سنن ابی داؤد‘‘ ہے ایک تخت پر سیدنا شہاب الدینؒ ہیں جن کے پاس ’’مواہب لدنیہ‘‘ ہے جس میں رسول اللہ ﷺ کے حالات و سیرت کی احادیث ہیں اور ایک چھوٹے سے تخت پر حضرت علی تقیؒ ہیں اور ان کے پاس ان کی کتاب ’’کنز العمال‘‘ ہے جو احادیثِ نبویؐ کے ’’دائرۃ المعارف‘‘ کا حکم رکھتی ہے ، وہیں ایک جانب احمد بن حجر عسقلانیؒ بیٹھے ہیں اور ان کے پاس ’’تہذیب التہذیب‘‘ ہے جس میں اسمائے رجال ہیں ۔ ایک تخت پر شمس الدین ذہبیؒ ہیں ، اور ان کے پاس ’’تذکرۃ الحفاظ‘‘ ہے ، جس میں حافظانِ حدیث کا ذکر ہے ۔ واضح ہو کہ محدثین اس شخص کو حافظ کہتے ہیں جس کو کم از کم ایک لاکھ حدیثیں یاد ہوں ۔

ایک اور در پر یہ کتبہ ہے :

فَاسْئَلُوْٓا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔ فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الْاَبْصَارِ ۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ۔ یہ درفقہاء کا ہے ، اس در کے پاس کے تختوں میں سے ایک تخت پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ، اور ایک ایک تخت پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ ، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں ، اور ایک حجرہ میں حضرت ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا ہیں ۔ ایک تخت پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ، ایک پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ایک پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہیں ، انہیں تختوں کے پاس امام اعظم ابو حنیفہ نعمان بن ثابت کوفی رحمتہ اللہ علیہ بیٹھے ہوئے ہیں ، انھوں نے قرآن و حدیث سے استنباطِ مسائل کیا ، امام ابو حنیفہؒ کی مجلسِ فقہا میں امام ابو یوسفؒ ، امام محمد بن الحسنؒ وغیرہ چالیس محدّث و فقیہ ایک گول میز کے اطراف بیٹھے ہوئے ہیں ۔

امام محمد بن الحسنؒ کے پاس ''سیر کبیر'' وغیرہ فقہ کی کتابوں کا انبار ہے۔ ایک جدا تخت پر امام مالک بن انسؒ مع مؤطا کے تشریف فرما ہیں۔ مؤطا تمام کتبِ حدیث کی ماں ہے۔ ایک اور تخت پر امام محمد ابن ادریس شافعیؒ ہیں۔ ان کے پاس ''کتاب الام'' ہے۔ امام محمد ابن الحسنؒ اور امام محمد بن ادریس شافعیؒ کے باہمی مباحثات اور مذکرات سے اصولِ فقہ اور اصولِ حدیث کی بناء پڑی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ رومن لا کا نام و نشان بھی کوئی نہ جانتا تھا۔ یاد رکھو کہ قرآن و حدیث ہی فقہ اسلام کا ماخذ ہیں۔ وہ شخص ہرگز فقیہ نہیں ہوسکتا جو بغیر قرآن و حدیث کے ماخذ کے ذاتی رائے رکھتا ہو، جس نے بلا ماخذ کوئی حکم دیا وہ اس پر رد ہے اس پر بے حد کد ہے۔ ایک تخت پر حضرت امام احمد بن حنبلؒ ہیں جن کے پاس ''مسند احمد'' ہے، یہ حدیث شریف کا بڑا ذخیرہ ہے۔ امام احمدؒ ضعیف حدیث کے مقابل قیاس سے کام نہیں لیتے۔ دوسری کرسیوں پر مجتہد فی المذہب، اصحابِ ترجیح، مجتہد فی المسئلہ بیٹھے ہوئے ہیں جو ہر زمانہ کے اقتضاء کے موافق قرآن و حدیث سے استنباطِ مسائل کرتے ہیں۔ ہر زمانہ میں چند افراد کو استنباطِ مسائل کی کرسی مل ہی جاتی ہے۔

ایک دوسرے در پر یہ کتبہ ہے:

اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ۔

یہ در متکلمین کا ہے۔ اس در کے پاس بھی بہت سے تخت بچھے ہیں جن میں سے ایک تخت پر حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما ہیں، انھوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حکم سے خوارج سے مناظرہ کیا کیونکہ اس زمانے میں خوارج اور روافض پیدا ہوچکے تھے۔ اس دور میں مذہبی اختلافات کا فوری فیصلہ تلوار کردیتی تھی۔ یہ یاد رکھو کہ بعض لوگ بزرگوں کو مانتے ہیں اور بعض بالکل نہیں مانتے۔ اعتدال پر رہنے والے بہت کم ہوتے ہیں۔ بزرگوں کو ماننے والوں کی انتہا شخصیت پرستی اور بُت پرستی ہوتی ہے، اور خود پسندوں کی انتہا دہریت اور لادینی پر۔ ایک تخت پر حضرت امام ابو حنیفہؒ نعمان بن ثابت کوفی ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''فقہِ اکبر'' ہے۔ امام اعظمؒ کو خوارج سے ہر وقت مناظرے کرنے پڑتے۔ ایک اور تخت پر حضرت ابو الحسن اشعریؒ ہیں جو معتزلیوں کے رد میں سرگرم ہیں۔ معتزلہ کے پاس ان کی عقل کے خلاف کوئی چیز اسلام میں نہیں ہے۔ اصل میں وہ ایک غلطی میں گرفتار ہیں کہ جو چیز میں نہیں جانتا یا میرے پاس ثابت نہیں وہ واقع ہی نہیں اور ایک تخت پر امام محمد غزالیؒ تشریف فرما ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''تہافتہ الفلاسفہ'' وغیرہ علم کلام کی کتابیں ہیں۔ امام غزالیؒ کے زمانے سے پہلے عربی میں مختلف فلاسفہ کی کتابوں کا ترجمہ ہوچکا تھا۔ ان کی کتابوں سے عقائد، تصوف، تہذیبِ اخلاق وغیرہ، سب کا افادہ ہوتا ہے۔ فلسفہ کی کتابیں تیار کروانے میں خلیفہ مہدی اور ہارون رشید بہت پیش پیش رہے ہیں۔

ایک اور تخت پر امام فخر الدین رازیؒ ہیں جنھوں نے فلسفہ قدیم کے پرخچے اڑادیئے، ان کے ہاتھ میں مباحثِ مشرقیہ، معالم وغیرہ بیسیوں علم کلام کی کتابیں ہیں۔ ایک اور تخت پر قاضی عضد الملۃ والدین عبدالرحمٰن بن احمدؒ بھی بیٹھے ہیں اور ان کے ہاتھ میں ''مواقف'' ہے۔ اس قاضی کے حسنِ تعلیم سے لاکھوں چنگیز خانی اشخاص مشرف بہ اسلام ہوگئے۔ اور دوسری کرسیوں اور چوکیوں پر ہزاروں خادمانِ دین ممتکن ہیں جو ہمیشہ مخالفانِ اسلام کی تردید میں سرگرم و مستعد رہے ہیں۔

ایک اور در پر یہ کتبہ ہے:

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ ۔ قَاتِلُوْٓا اَوْلِيَآءَ الشَّيْطٰنِ اِنَّ كَيْدَا لشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ۔ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ ؛ یہ در جانبازانِ محمدیؐ کا ہے، مجاہدین فی سبیل اللہ کا ہے۔ اس کے پاس ایک تخت پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں جنھوں نے مرتدین سے جنگ کی، مانعینِ زکوٰۃ کو زکوٰۃ دینے پر مجبور کیا۔ اس طرح مرکزِ اسلام کی حفاظت کی۔ اور ایک تخت پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں جن کے زمانے میں بیت المقدس، شام اور ایران فتح کرکیا گیا۔ ایک اور تخت پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں جن کے زمانے میں اسلامی ریاست کے حدود دور دور تک پہنچ گئے تھے۔ ایک اور تخت پر حضرت علی ابن ابی طالب رضی اللہ عنہ فاتحِ خیبر ممتکن ہیں، ان کی تلوار بھی کام کرتی تھی، اور ان کی روحانی قوت بھی کام کرتی تھی۔

ایک اور تخت پر حضرت ابو عبیدۃ بن جراح فاتحِ شام، اور ایک تخت پر حضرت ابنِ ابی وقاص فاتح ایران وعراق، اور ایک پر حضرت عمرو بن العاص فاتحِ مصر بھی ہیں، اور ان تختوں کے بیچ میں حضرت سیف اللہ مجاہدِ اعظم خالد بن ولید کا تخت ہے۔ پاس ہی ایک تخت پر خلیفہ بنی امیہ ولید بن عبدالملک بیٹھا ہوا ہے اور اس کے اطراف دوسرے تختوں پر محمد بن قاسم فاتح سندھ و ہند، موسیٰ بن نصیر اور اس کا خادم طارق فاتح اندلس، اور قتیبہ بن مسلم فاتح ترکستان بیٹھے ہوئے ہیں۔ ایک اور تخت پر نور الدین زنگی اور صلاح الدین اعظم ایوبی ہیں جنھوں نے صلیبی جنگوں میں کار ہائے نمایاں کئے جن کی دوست و دشمن سب نے داد دی۔ اور ایک تخت پر سلطان محمد خاں ترک فاتح قسطنطنیہ ہے۔ ایک تخت پر سلطان محمود غزنوی فاتح ہند، اور ایک پر شہاب الدین غوری ہیں۔ ایک تخت پر جلال الدین خلجی بیٹھے ہیں جنھوں نے چنگیزی فوجوں کو شکستِ عظیم دی اور جب گرفتار شدہ ایک لاکھ قیدیوں کو رہا کردیا تو وہ سب مسلمان ہوگئے۔ ان کے تخت کے ایک حصّہ پر علاء الدین خلجی بھی ہے۔ ایک پر احمد شاہ ابدالی ممتکن ہیں جنھوں نے تھوڑی سی فوج سے مرہٹوں کو شکستِ عظیم پہنچائی۔

ایک اور در پر یہ کتبہ ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا ۔ وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ ۔ اور ذرا باریک خط میں یہ بھی ہے: اَلْمُسْلِمُوْنَ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهٗ بَعْضًا ۔ یہ درمدنیات، اصلاح وترقی، تمدن، حفظِ امن اور حفاظت اقتدارِ اعلیٰ کا ہے۔ اس کے پاس ایک بڑا تخت ہے جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جلوہ فگن ہیں۔ جنھوں نے مانعینِ زکوٰۃ سے جنگ کی اور مرتدین سے جہاد کرکے شیرازۂ اسلام کو منتشر ہونے سے بچایا، اجنادین کی فتح بھی انہیں کے زمانے کی ہے۔ علماء نے اس کے متعلق کہا ہے: ''وَلَقَدْ قَامَ مَقَامَ نَبِيِّهٖ''۔ حضرت صدیقِ اکبرؓ نے تمام اصحاب سے لے کر ایک جگہ جملہ مکتوباتِ قرآنی کو جمع کردیا اور اس طرح حَبْلُ اللّٰه کی حفاظت فرمائی۔ پاس ہی ایک دوسرا تخت ہے۔ جس پر حضرت فاروقِ اعظمؓ تشریف فرما ہیں جن کے زمانے میں نہ صرف غیر معمولی فتوحات حاصل ہوئیں، بلکہ زمین کی پیائش ہوئی، مقطعوں کا انتظام ہوا بلحاظِ ضرورت مختلف قوانین نافذ اور طرح طرح کے محصول رعایا پر عائد کئے گئے۔ ایک اور تخت پر خیر التابعین عمر ابن عبدالعزیزؒ ہیں جنھوں نے آزاد تمدن کو اسلامی تمدن میں مبدل کرنے کی کوشش کی اور اس میں اپنی جان دے دی۔ ایک اور تخت پر شاگردِ امام مالک، ہارون رشید ہے جس کے زمانے میں امن و امان اور علم و دولت دونوں انتہائی عروج پر تھے۔ ایک چھوٹے

سے تخت پر جلال الدین خلجی ہے جس کے ایک گوشے پر علاء الدین خلجی بھی بیٹھا ہوا ہے جس کے زمانے میں فتوحات بھی ہوئی ہیں اور ترقیِ تمدن بھی ۔ ایک چھوٹے سے تخت پر شیرشاہ سوری بھی ہے جس کے زمانے میں شہروں میں تنظیم ، راستوں کا انتظام ، مسافروں کے لئے سہولت اور مالگزاری کا ہر طرح سے انتظام تھا ۔ اس در کے ایک جانب علمائے مدنیات اپنے اپنے تختوں پر متمکن ہیں ۔ ایک تخت پر حضرت ابوحامد محمد غزالیؒ ہیں جن کے پاس ان کی اعلیٰ اور کثیر تصانیف دھری ہیں ، ان کی ''احیاء العلوم'' میں اسلامی تمدن سے کافی بحث کی گئی ہے ایک تخت پر حضرت شیخ احمد بن عبدالاحد فاروقیؒ ہیں ۔ آپ اکبر اور جہانگیر کے ہم زمانہ تھے ، ان کے زمانے میں تصوف ، الحاد میں مبدل ہوگیا تھا ۔ خود پرستی ، شاہ پرستی کا زور تھا ۔ حضرت شیخ احمد سرہندیؒ کو اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا اور یہ یادگارِ فاروق اعظمؓ نہایت پامردی سے حمایتِ دین پر قائم رہا ۔ آپ کے فیضِ تربیت سے لاکھوں آدمی اب تک سیراب ہورہے ہیں ۔ آپ کے پاس ''مکتوباتِ شریف'' کی تین جلدیں دھری ہوئی ہیں ۔ ایک چھوٹے سے تخت پر ''ابنِ خلدون'' ہے ، جس کے پاس ''تاریخِ اسلام'' اور ''مقدمہ'' رکھے ہوئے ہیں ۔ مقدمہ میں اصولِ تمدن اور فلسفہ تاریخ پر کافی بحث موجود ہے اور ایک چھوٹے سے تخت پر احمد بن عبدالرحیم المعروف بہ شاہ ولی اللہؒ دہلوی بیٹھے ہوئے ہیں جن کے پاس ''حجتہ اللہ البالغہ'' دھری ہے ۔ یہ کتاب فلسفۂ اسلام سے بھری ہے ۔ ان کے پاس ''ازالتہ الخفاء عن احوال الخلفاء'' بھی ہے جو ہے تو تاریخ مگر اس سے تمدنِ اسلام پر بھی خوب روشنی پڑتی ہے ۔

آگے ایک اور در پر یہ کتبہ کندہ ہے :-

اَنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ ۔ وَمَنْ یَّعْشُ عَنْ ذِکْرِالرَّحْمٰنِ نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطَانًا ۔ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ التَّوَّابِیْنَ وَ یُحِبُّ الْمُتَطَھِّرِیْنَ ۔ وَالَّذِیْنَ ھُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۔ اِعْلَمُوْآ اَنَّمَا الْحَیٰوۃُ الدُّنْیَا لَعِبٌ وَّلَھْوٌ وَّ زِیْنَۃٌ وَّتَفَاخُرٌ بَیْنَکُمْ وَتَکَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَاَلاَوْلَادِ ۔

ذرا باریک خط میں یہ کتبہ بھی موجود ہے :

اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ ۔ مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُہٗ مَالَا یَعْنِیْہِ ۔ بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ مَکَارِمَ الْاَخْلَاقِ ۔ تَخَلَّقُوْا بِاَخْلَاقِ اللّٰہِ ۔ یہ درتہذیبِ نفس کا ہے ۔ اس کے پاس ایک تخت پر حضرت عبدالرحمٰن بن عمر اور ایک پر حضرت امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں ، یوں تو اس در کے پاس بہت سی واجب التعظیم ہستیاں موجود ہیں مگر خصوصیت سے چند حضرات کے نام بیان کئے جاتے ہیں ۔

ایک تخت پر امام ابو حامد محمد غزالیؒ ہیں ، ان کے پاس ''احیاء العلوم'' اور ''کیمیائے سعادت'' وغیرہ کثیر تصانیف ہیں ۔ ''احیاء العلوم'' کی چار جلدیں ہیں ۔ ایک میں عقائد و معارف ہیں ۔ ایک جلد میں سیاستِ مدن و تہذیبِ نفس ہے ۔ ایک جلد میں منجیات ہیں اور ایک جلد میں مہلکات ۔ ایک اور تخت پر حضرت غوثِ اعظم سیدی عبدالقادر جیلانی رحمتہ اللہ علیہ تشریف رکھتے ہیں ۔ اور ان کے ہاتھ میں ''فتوح الغیب'' اور ''فتحِ ربانی'' ہے ۔ ایک کرسی پر جلال الدین دوانیؒ ہیں ، اور ان کے پاس ''اخلاقِ جلالی'' ہے ۔ اس کے تین حصّے ہیں ۔ ایک میں سیاستِ مدن ، ایک میں سیاست و انتظام خانہ داری اور ایک میں تہذیبِ نفس ۔ دوانی نے عقائد جلالی اور دیگر کتب میں فلسفۂ اسلام اور علمِ کلام پر بھی کافی مباحث لکھے ہیں اور کئی کرسیوں پر بہت سے تہذیبِ نفس کے معلّم ہیں ۔

ایک اور در ہے جس پر حسبِ ذیل کتبہ ہے:

قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ۔ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ۔ وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَمَا كُنْتُمْ ۔ اَيْنَمَا تُوَلُّوا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۔ وَفِيْ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۔ سَنُرِيْهِمْ اٰيَاتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الحَقُّ ۔

ذرا باریک خط میں یہ بھی ہے:

اَصْدَقُ كَلِمَةٍ قَالَتْهَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِيْدٍ "اَلَا كُلُّ شَيْءٍ مَاخَلَااللّٰهَ بَاطِلُ" ۔

یہ موحدین کا در ہے ۔ یہاں کے حاضرین کئی قسم کے ہیں ۔ بعض بڑے زور وشور سے توحید کی تعلیم دیتے ہیں، بعض اصحاب، عظیم الشان کتابوں کے مصنف بھی ہیں، اور بعض کے فیضِ تربیت اور حسنِ صحبت سے لوگ موحد ہوجاتے ہیں ۔ یہاں ایک بڑے تخت پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں اور ان کی زبانِ مبارک سے نکل رہا ہے: مَارَأَيْتُ شَيْئًا اِلَّا وَرَأَيْتُ اللّٰهَ قَبْلَهُ ۔ (میں نے کسی شئی کو دیکھا تو شئے سے پہلے خدا کو دیکھا) آپ کے متعلق رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "مُردے کو چلتا پھرتا دیکھنا ہو تو ابوبکر کو دیکھو"۔ نیز یہ بھی ارشاد ہوا کہ: "جس چیز سے خدا نے میرا شرحِ صدر کیا ہے اس سے میں نے ابوبکر کا بھی شرحِ صدر کیا"۔

ان کے تخت کے اطراف قادریہ، نقشبندیہ اور شطاریہ کے تخت ہیں ۔

ایک اور تخت پر حضرت علی ابن ابی طالبؓ جلوہ گر ہیں، اور وہ فرماتے ہیں: "سَلُوْنِيْ اُجِبْكُمْ" (مجھ سے مانگو میں دوں گا) آپ کے بارے میں رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: "میرا گوشت علی کا گوشت ہے اور میرا خون علی کا خون"۔

آپ کے اطراف قادریہ، چشتیہ، رفاعیہ، اکبریہ، سہروردیہ، شاذلیہ اور بدویہ کے تخت ہیں ۔ ان تختوں کے پاس اور دوسری محترم ہستیوں کے تخت بھی ہیں ۔ جیسے حضرت حسن بصری، حضرت معروف کرخی، حضرت جنید بغدادی، حضرت بایزید بسطامی، حضرت داؤد طائی، حضرت سہل بن عبداللہ تستری، حضرت کمیل بن زیاد، حضرت ذوالنون مصری، حضرت ابوالقاسم قشیری ۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کے زمانہ میں بیرونی مصنفین کی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا گیا ۔ فقط ان کی توجہِ عالی اور قوتِ قلبی سے لاکھوں بلکہ کروڑوں آدمیوں نے زلالِ توحید سے سیرابی حاصل کی ۔ ان تختوں کے پاس خصوصیت سے قابلِ ذکر شیخ محی الدین ابن العربیؒ ہیں اور ان کے پاس "فتوحات مکیہ"۔ اور "فصوص الحکم" وغیرہ کتابیں ہیں ۔ ایک تخت پر مولانا جلال الدین رومیؒ بیٹھے ہیں اور ان کے پاس "مثنوی شریف" رکھی ہے ۔

ایک اور در پر یہ کتبہ ہے:

يُحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّالِلّٰهِ ۔ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗ ۔ يَخِرُّوْنَ لِلْاَذْقَانِ يَبْكُوْنَ وَيَزِيْدُهُمْ خُشُوْعًا ۔ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى صَعِقًا ۔ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِاللّٰهِ ۔

ذرا خفی خط میں یہ بھی کندہ ہے:

اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ وَاَنْتَ مَعَ مَنْ اَحْبَبْتَ ۔ یہ درعشق ومحبت کا در ہے، اس در سے جو پانی آرہا ہے اس کا

ایک گھونٹ بھی پی لینا ، پینے والے کو مستِ الست کردیتا ہے ، جو اس کا پانی پیتے ہیں ، ان میں سے بعض عاشق کہلاتے ہیں اور بعض معشوق ، کچھ محبّ ہوتے ہیں اور کچھ محبوب ۔ کوئی چاہتا ہے اور کوئی چاہا جاتا ہے ۔ غرض آیت یُحِبُّھُمْ وَیُحِبُّوْنَہٗ سے معلوم ہوتا ہے کہ محبِ خدا محبوبِ خدا بھی ہوتا ہے اور محبوبِ خدا محبِ خدا بھی مگر دونوں میں امتیاز صرف یہ ہوتا ہے کہ جو چیخا چلّایا وہ عاشق کہلایا اور جس نے ضبط کیا ، صبر وسکون سے بیٹھا وہ معشوق ۔

اس در کے پاس ایک تخت ہے جس پر حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں ، دوسرے تخت پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ تیسرے پر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ، اور چوتھے پر حضرت علی رضی اللہ عنہ جلوہ فرما ہیں ۔ ایک اور تخت پر امام حسن مجتبیٰ رضی اللہ عنہ ، ایک پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ ، ایک تخت پر حضرت اویس قرنی بھی ہیں ۔ ایک تخت پر حضرت بلال حبشی رضی اللہ عنہ بیٹھے ہوئے اَحَدْ ، اَحَدْ کا نعرہ مار رہے ہیں ۔ اس در کے پاس سینکڑوں تخت بچھے ہوئے ہیں اور یہ سلسلہ انشاء اللہ قیامت تک جاری رہے گا ، تاہم چند تخت نشینانِ ولایت کے نام بیان کردیئے جاتے ہیں ۔

سیدی عبدالقادر جیلانی ، سیدی شیخ شہاب الدین عمر سہروردی ، سیدی خواجہ معین الدین حسن سنجری چشتی ، سید احمد الکبیر الرفاعی ، سیدی ابوالعباس احمد بدوی ۔ سیدی بہاء الدین محمد النقشبند ، سیدی ابوالحسن علی شاذلی ، سیدی جلال الدین مولانا روم ، سیدی محی الدین محمد بن علی ابن العربی ، سیدی بدیع الدین شاہ قطب المدار ، سیدی علاء الدین علی صابر ، سیدی نظام الدین محبوبِ الٰہی ، سیدی خواجہ محمد صدیق محبوب اللہ رحمہم اللہ ۔

اس کے پاس ہی ایک اور در ہے جس پر یہ آیت کندہ ہے :

یٰٓاَیَّتُھَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّۃُ ارْجِعِیْٓ اِلٰی رَبِّکِ رَاضِیَۃً مَّرْضِیَّۃً o فَادْخُلِی فِیْ عِبَادِیْ o وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ o

ذرا باریک خط میں یہ بھی لکھا ہوا ہے :

وَمَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ اَدَآءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْہِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّہٗ فَاَذَا اَحْبَبْتُہٗ کُنْتُ سَمْعَہُ الَّذِیْ یَسْمَعُ بِہٖ وَبَصَرَہُ الَّذِیْ یُبْصِرُبِہٖ وَیَدَہُ الَّتِیْ یَبْطِشُ بِھَا وَ رِجْلَہُ الَّتِیْ یَمْشِیْ بِھَا وَاِنْ سَأَلَنِیْ اَعْطَیْتُہٗ وَ اِنِ اسْتَعَاذَنِیْ اَعَذْتُہٗ ۔

یہ درعبدیت کا ہے ۔ اس در کے لوگ عبدیت سے ممتاز ہیں اور صاحبِ قرب فرائض ۔ یہ بے ارادہ جیتے ہیں ، مردہ بدستِ زندہ ، زندہ رہتے ہیں ۔ خدا کو دینا ہوتا ہے تو ان کے ہاتھ سے دیتا ہے ، کچھ کام لینا ہوتا ہے تو ان کے ہاتھوں سے لیتا ہے ۔ ہر شخص کو ، ہر چیز کو اس کا حق دینا ان کا کام ہے ۔ اقتضائے وقت کے مطابق عمل کرنا ان کا شیوہ ہوتا ہے ۔ تحتِ امر رہنا ہمیشہ ان کے پیشِ نظر رہتا ہے ، ایسے لوگ عامتہ الناس سے ایسے ملے جلے رہتے ہیں کہ ان کا دوسروں سے امتیاز کرنا مشکل ہے کھاتے پیتے ہیں ، شادی بیاہ کرتے ہیں ہنستے بولتے ہیں ۔ ایسے لوگوں کی زبان پر یہ شعر ہوتا ہے

دل کسی سے نہ لگا دست فشاں سب سے رہے
عمر بھر قیدِ تعلق سے ہم آزاد رہے (حسرت صدیقی)

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس در سے سیراب ہونے والے محبّ بھی ہیں ، محبوب بھی ہیں اور بندے بھی ، مگر ایک گونہ خصوصیتِ بندگی کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے ہیں ۔

اس در کے پاس کئی تخت بچھے ہوئے ہیں ، ایک تخت پر خلیفۂ رسول اللہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ، ایک پر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ ، ایک پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ، ایک پر حضرت علی رضی اللہ عنہ ، ایک پر حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ اور ایک پر حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ تشریف فرما ہیں ۔ پاس ہی ایک تخت پر حضرت سیدی عبدالقادر جیلانی ہیں اور دوسرے کئی تختوں پر وہ سب حضرات بھی جلوہ فرما ہیں جن کے اسماءِ گرامی توحید اور عشق و محبت کے بیان میں گزر چکے ہیں ۔

غرض سینۂ محمدیؐ بہت کشادہ ہے اس میں جو کچھ ہے اس کو قیامت تک بیان کرو ، تم بیان کرو ، ساری دنیا بیان کرے مگر وہ نہ کبھی ختم ہوا ہے نہ ہوگا ۔ تم ختم ہوجاؤ گے اور دنیا ختم ہوجائے گی ۔

اعجاز القرآن

معجزہ : خدائے تعالیٰ کی مرضی و نامرضی کے سمجھنے سے انسانی عقل قاصر ہے ، لہذا خدائے تعالیٰ اپنے او امرونواہی ایک عالی استعداد غیر معمولی فطرت والے انسان پر نازل فرماتا ہے جس کو رسول یا پیغمبر کہتے ہیں ۔ اس کی اصولی تعلیم اس کے مکارمِ اخلاق ، بندگانِ خدا کی اصلاح ، اس کی بے غرضی ، اس کی انسانی ہمدردی ، اس کی راست بازی ، اس کی صداقت کے بہترین دلائل ہیں ، مگر خدائے تعالیٰ مزید تائید اور اذعان و یقین کی خاطر پیغمبروں کی معجزات سے تائید فرماتا ہے ۔

معجزہ مناسبِ اُمّت : پیغمبروں کے زمانے میں اُمّت کو جس کام میں مہارت ہوتی ہے اسی فن سے ملتا جلتا معجزہ عطا ہوتا ہے کیونکہ فنی مہارت کی وجہ سے وہ انسانی کام اور خدا کے کام میں تمیز کرسکتے ہیں ۔ جس فن میں کسی کو مہارت نہ ہو اُس کے اصول و مبادی سے واقف نہ ہو ، اس کی رائے ناقابلِ اعتداد اور غیر موثق رہتی ہے ۔

موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں ساحروں اور کاہنوں کا زور تھا تو ان کو عصا اور یدِ بیضا عطا کیا گیا ۔ عنہ المقابلہ فرعون اور اس کے اہلِ دربار کو سحر اور اعجازِ موسوی میں تمیز مشکل ہوگئی مگر ساحر ، جو اس فن میں ماہر تھے فوراً پکار اُٹھے : اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ رَبِّ مُوْسٰی وَ هَارُوْنَ ۔ اسی طرح حضرت عیسیٰؑ کے زمانے میں اطباء کا زور تھا تو حضرت عیسیٰ کو معجزہ عطا کیا گیا : جذامی ، کوڑھی کو اچھا کرنا ، مُردوں کو جلانا ، مٹی کی چڑیاں بنانا اور ان میں دم عیسوی پھونک کر زندہ کر کے اُڑا دینا ۔

دینِ ابدی و معجزہ ابدی : چونکہ گزشتہ زمانے کے پیغمبر خاص خاص قوموں اور محدود زمانوں کے لئے معبوث ہوئے تھے تو ان کے معجزے بھی وقتی تھے ۔ حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ کافتہ الناس کے لئے معبوث ہوئے ہیں ، آپ کا دین قیامت تک رہنے والا ہے تو ان کو ہزارہا معجزات ، گوناگوں خوارق عادات کے علاوہ جن کی روایت حدِ تواتر کو پہنچتی ہے ، قرآن شریف ایک ایسا دائمی معجزہ عطا کیا گیا ، جو اس دائمی دین کی تائید کرتا رہے گا ۔

وجہِ اعجازِ قرآن : قرآن شریف کس امر میں معجزہ ہے؟ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔

صرفہ : نظّام جو بڑا ادیب ہے اور فلسفی بھی، کہتا ہے کہ قرآن کے جواب دینے کی قوت اللہ تعالیٰ نے حضرتؐ کے اہل زمانہ سے سلب کرلی تھی۔ اس کے خیال میں قرآن شریف کا مثل ممکن تھا مگر سب لوگوں سے وہ قوت ہی سلب کرلی گئی تھی تو جواب کیونکر دیا جاسکتا تھا۔ اس کا خیال بالکل غلط ہے کیونکہ اس طرح قرآنِ مجید، معجزہ نہ ہوا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فصحاء و بلغاء سے جواب کی قوت سلب کرلینا معجزہ ہوا۔ افسوس کہ اتنے بڑے ادیب پر قرآن کی حقیقت نہ کھلی، ورنہ قرآن کی ایک ایک سورۃ، ایک ایک آیت پر سردھنتا، قربان ہوتا۔ غالباً وہ قرآن شریف کو سہلِ ممتنع سمجھ کر اس ورطے میں غوطے کھا رہا ہے کہ قرآن کا مثل ممکن ہے۔ مگر یہ امکان کبھی فعلیت میں نہیں آتا۔

یہ ہم نے بیان کیا ہے کہ پیغمبر کی اُمّت جس فن میں ماہر ہوتی تھی اسی جنس کا معجزہ پیغمبروں کو دیا جاتا تھا۔ حضرت رسالت مآبؐ اس قوم میں پیدا ہوئے جس کو اپنی فصاحت و بلاغت کا بڑا دعویٰ تھا۔ وہ خود کو عرب یعنی فصیح اور دوسروں کو عجم یعنی گونگا کہتی تھی لہذا قرآن شریف کی فصاحت و بلاغت معجزہ بنائی گئی۔

لاریب، ہم قرآنِ مجید کو فصاحت و بلاغت میں معجز اور واضح معجز سمجھتے ہیں، مگر اس کے ساتھ یہ بھی جانتے ہیں کہ قرآنِ مجید، تمام جہان کے لئے داعی الی الحق ہے۔ ہر صاحبِ فن ٹھنڈے دل سے قرآن پر غور کرے گا تو قرآن اسی کے اعتبار میں معجز بن کر چمکے گا۔ فقیر نے چند وجوہِ اعجازِ قرآن کو ''تحفہ فقیر'' میں نظم کیا ہے جو ہدیۂ ناظرین ہیں۔ آئندہ اس سے تفصیلی بحث کی جائے گی۔

مرضی و نامرضیِ خدا ظاہر کرتی رسالت ہے
دینِ محمد ہے توحید سارے جہاں کو دعوت ہے
ایک خدا کو سب پوجیں سرِّ ختم نبوت ہے
وجہِ اعجازِ قرآں حضرت کی امیت ہے
ماضی و مستقبل کی خبر مملو جس میں صداقت ہے
زیر و زبر کا فرق نہیں کیا قرآں کی حفاظت ہے
سارے منتر ہوگئے ہیچ کیسی اثر میں قوت ہے!
نغمہ اور الفاظ سلیس نیز کمالِ فصاحت ہے
کمی زیادت اور تغییر ناممکن وہ بلاغت ہے
پست و بلند نہیں اس میں ایک ہی اس کی حالت ہے
اسلوبِ قرآن ہے اور اور حدیث کی حالت ہے
جس نے دیکھا قرآں کو وہ تو محوِ حیرت ہے
شانِ خدائی ظاہر ہے لہجہ میں کیا سطوَت ہے

قرآں نے سب دینوں میں کچھ نہیں چھوڑی وقعت ہے
کرتے دھرم کی ہیں اصلاح جن میں قرآنیت ہے

سارے جہاں کو زیر کیا
کیا قوت کیا عظمت ہے (حسرت صدیقی)

اُمّیتِ رسُولِ کریمؐ : حضرتؐ کے زمانے میں تعلیم کا رواج اور لکھنے پڑھنے کی واقفیت ہی کم تھی ۔ نہ مدارس تھے نہ مکاتب، خال خال کوئی مذہبی پیشوا لکھنا پڑھنا جانتا تھا ۔ بعض تجارت پیشہ یا سردارانِ قوم کچھ کچھ کتابت سے واقف تھے ۔ پھر حضرت محمد مصطفےٰ ﷺ ابھی شکمِ مادر ہی میں تھے کہ حضرتؐ کے والدِ ماجد عبداللہ کا انتقال ہوگیا ، چھ سال کے تھے کہ والدہ ماجدہ بی بی آمنہ کا بھی انتقال ہوگیا ، پھر آٹھ سال کے تھے کہ جدِّ امجد عبدالمطلب کا بھی انتقال ہوگیا ۔ پھر تعلیم و تربیت کرتا تو کون کرتا ۔ مگر نہیں ، اللہ ان کا محافظ و مربی تھا اور وہی علمِ لدنی سے آپ کو سرفراز کرنے والا تھا ، کوئی شخص ٹھنڈے دل سے غور کرے کہ جس شخص کو کسی نے تعلیم نہ دی ہو ، جس کا کوئی تربیت کرنے والا نہ ہو ، جس کا ماحول تاریک ہو ، ہر طرف جہل کی گرم بازاری ہو ، وہ شخص اپنے ہاتھ میں مشعلِ ہدایت لے کر نکلتا ہے اور سارے عالم کی کایا پلٹ دیتا اور شرک و کفر کی تاریکی کو کافور کردیتا ہے ۔ روئے زمین کے بڑے بڑے ادیان و مذاہب کو تقویم پارینہ منوا دیتا ہے ۔ بڑی بڑی ریاستوں اور سلطنتوں کے قوانین کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے اور خود ان زبردست سلطنتوں کو پامالِ سم ستوران کردیتا ہے ، کیا یہ اعجاز نہیں ہے ؟ کیا خدا کا ہاتھ جب تک اس کی پشت پر نہ ہو کوئی ہے جو ایسا ناقابلِ انکار کام کرسکتا ہے ۔ ؟ تاریخِ عالم اس کی ایک بھی مثال دکھا سکتی ہے ؟ نہیں ، ہرگز نہیں !

وَمَا كُنْتَ تَتْلُوْ مِنْ قَبْلِهٖ مِنْ كِتَابٍ وَّلَا تَخُطُّهٗ بِيَمِيْنِكَ اِذًالَّارْتَابَ الْمُبْطِلُوْنَ ۔ (العنکبوت آیت ۴۸)

فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَ كُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۔ (البقرة آیت ۲۳)

حفاظتِ قرآن : دنیا میں کوئی مذہبی یا غیر مذہبی کتاب ایسی نہیں جس کی حفاظت قرآنِ مجید کے برابر کی گئی ہو ، ہندوؤں کے وید ، پارسیوں کی ژندیا دساتیر بلکہ تورات و انجیل ، تواتر تو کجا خبر احاد سے بھی ثابت نہیں ہوسکتیں ۔ قرآن شریف کی حالت یہ ہے کہ زمانہ نبوت سے اب تک لاکھوں اس کے راوی ، اس کے حافظ ، اس کے قاری چلے آرہے ہیں ۔ کوئی شہر تو کیا کوئی قصبہ ایسا نہیں جس میں چند جید حافظ نہ ہوں ۔ کیا مجال ، کوئی حافظ تراویح میں ایک کلمہ کے عوض دوسرا کلمہ پڑھ دے ، یا زیر زبر ہی کی غلطی کردے اور سامع اس کو لقمہ نہ دے ۔ یہ تو فاش اغلاط ہیں ، قاری صفاتِ حروف کی بھی تنقید کرتا ہے ، کب چھوڑتا ہے اگر کوئی قلقلہ یا ہمس نہ کرے یا مدِ طویل و متوسط و طبعی میں تمیز نہ کرسکے یا بے محل تفخیم یا ترقیق کردے ، یا اخفاء کی جگہ اظہار یا ادغام کردے ، کب جائز رکھتا ہے ۔ قرآن شریف میں کتنے الف ہیں ، کتنے با ، تا ۔ سب شمار کئے ہوئے ہیں ۔ غرض کہ قرآن شریف کی حفاظت کا وعدہ خدا نے کیا اور کس ناقابلِ انکار طریقہ سے اس کو ثابت کیا ۔ دنیا میں اسلام ہی باقی رہنے والا دین ہے تو اس کا منبع ، اس کی مقدس آسمانی کتاب اتنی اہمیت بھی رکھتی ہے ۔ جو چیز محفوظ ہی نہ ہو ، جس کی صحت کا پتہ نہ ہو ، جس کی روایت ہی مسلسل نہ ہو ، کس برتے پر اس کی تبلیغ کی جاسکے گی اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۔

قرآن کی غیب گوئی : یہ بات ظاہر ہے کہ آدمی کو نہ ماضی کا علم ہوتا ہے نہ مستقبل کا ، وہ تو صرف وہی جانتا ہے جو اس کی آنکھوں کے سامنے آئے یعنی اس کا علم مشاہدات تک محدود ہے ، مزید برآں یہ کہ وہ مشاہدات ہی کو الٹ پلٹ کرتا ہے کچھ انہیں سے استنباط کرتا ہے ۔ اخبار بالغیب مادی انسان کا کام نہیں ، جب تک خدا کا ہاتھ بیچ میں نہ ہو ، یہ کام نہیں ہوسکتا ۔ قرآن شریف میں وہ قصص بھی بیان کئے گئے ہیں جن سے حضرتؐ کا تمام خاندان ناآشنا تھا اور ایسی پیشن گوئیاں بھی ہیں جو اب تک برابر صحیح اور درست اترتی آئی ہیں ۔

قصص : حضرت آدمؑ ، دادی حوا اور ابلیس کا قصہ ۔ ہابیل قابیل کا واقعہ ۔ حضرت نوحؑ ، حضرت ابراہیمؑ و اسمٰعیل و لوط و اسحاق و یعقوب و یوسف علیہم السلام کے قصص ۔ حضرت صالحؑ و قوم ثمود ، حضرت شعیبؑ و اہلِ مدین و ایکہ ، حضرت داؤد و سلیمانؑ ، حضرت موسٰیؑ و ہارونؑ اور فرعون و ہامان اور بنی اسرائیل اور قارون کے حالات و دیگر انبیاء کے حالات ، ذوالقرنین ، قوم سبا ، اصحاب الاخدود کہف و رقیم اور اصحاب رس کے قصص و حالات بالتفصیل بیان کئے گئے ہیں ، حضرت کے اہلِ زمانہ مخالفین نے بھی ان کو تسلیم کیا ۔

پیش گوئی : قرآن شریف میں بہت سی پیشین گوئیاں ہیں ، نمونے کے طور پر چند یہاں ذکر کی جاتی ہیں :

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ اِلٰى قَوْمٍ اُولِيْ بَاْسٍ شَدِيْدٍ تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْيُسْلِمُوْنَ ۔ (الفتح ۔ ۱۶)

”(اے پیغمبر) دیہاتی عرب جو (سفر حدیبیہ سے) رہ گئے ہیں ان سے کہہ دو کہ تم بڑے لڑنے والوں (یعنی فارس و روم) کے مقابلے کے لئے بلائے جاؤ گے تو تم ان سے لڑتے رہوگے ، یہاں تک کہ وہ مسلمان ہوجائیں گے“۔

روم و فارس کی لڑائیاں حضرت ابوبکر صدیق ، عمر فاروق رضی اللہ عنہا کی خلافت میں ہوئیں ، تو یہ خلافتِ شیخین کی بشارت ہے ۔

الٓمّٓ ۔ غُلِبَتِ الرُّوْمُ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ (الروم ۔ ۱ تا ۳)

قریب کے ملک (یعنی فارس) میں رومی (جو نصاریٰ ہیں اہلِ فارس سے جو آتش پرست ہیں) مغلوب ہوگئے ہیں لیکن یہ لوگ اپنے مغلوب ہونے کے بعد عنقریب چند سال میں (پھر اہل فارس پر) غالب آجائیں گے ۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا ، اور یہ واقعہ ، تاریخِ پیش گوئی کا بڑا زبردست معجزہ ہے ۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اس وعدۂ الٰہی کی صحت پر یقین کر کے ایک سردار قریش سے مراہنہ کیا ، وعدہ الٰہی سچا ہوا ۔ اور ابوبکر صدیقؓ کامیاب ۔

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ۔ عنقریب اس جماعت کو ہزیمت ہوگی اور پیٹھ پھیر کر بھاگ کھڑے ہوں گے ۔ یہ شکستِ اہلِ بدر کی پیشگوئی تھی جس کو اللہ نے پورا کیا ۔ (القمر ۔ ۴۵) ۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّؤْيَا بِالْحَقِّ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ اٰمِنِيْنَ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَ مُقَصِّرِيْنَ لَا تَخَافُوْنَ ۔ (الفتح ۔ ۲۷)

”بے شک اللہ نے اپنے رسول کو واقعی سچا ہی خواب دکھایا تھا کہ انشاء اللہ تم (مسلمان) مسجدِ حرام میں بے خوف و خطر (باطمینانِ تمام) داخل ہوں گے (وہاں جاکر) تم (کچھ تو) سر منڈوائے ہوئے ہوں گے اور (کچھ) بال کترائے ہوئے

ہوں گے ۔ یہ آیت فتحِ مکّہ کی پیش گوئی ہے جس کو اللہ نے پورا کیا ۔

فصاحت و بلاغت : سب سے پہلے قرآن شریف کی نغمگی اور سلاست پر غور کرو ، قرآن شریف کے الفاظ کچھ ایسے نفیس مخارج کے حروف سے مرتب ہیں ، اور قرآن شریف میں ایسی سلاست و روانی ہے کہ نہ پڑھنے والے کی زبان پر گراں ہوتے ہیں نہ سننے والے کے کان پر ۔ اتنی ضخیم کتاب ، اتنا بڑا حجم اور اس میں ایک لفظ بھی ثقیل یا متنافر نہیں ۔ دوسرے شعراء اور خطباء کے کلام میں یہ بات کہاں ؟ ایک تجربہ مجھے ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ دوسروں کو بھی اس کا تجربہ ہوگا یا غور کرنے کے بعد اس کا تجربہ ہوجائے گا کہ بعض حضرات جو اپنی مادری زبان میں بات کرنے میں ہکلاتے ہیں ، وہ جب قرآن شریف پڑھتے ہیں تو زبان کو بالکل رکاوٹ نہیں ہوتی بلکہ ان کی زبان ، صاف زبان والوں سے بھی قرآن پڑھنے میں تیز چلتی ہے ۔ مجھے میرے کئی دوستوں پر اس کا تجربہ ہوا ہے ، خود میری زبان میں عقدہ ہے مگر قرآن شریف پڑھتا ہوں تو زبان صاف چلتی ہے ۔ یہ قرآن شریف کی سلاست اور حسنِ مخارج کی کافی دلیل ہے ۔

بعض بالکل جاہلوں کو دیکھا گیا ہے کہ قرآن شریف اور دوسرے ادعیہ کو پڑھتے ہوئے سنا تو قرآن شریف کے متعلق کہا کہ اس کا پڑھنا بڑا ہی اچھا معلوم ہوتا ہے ۔ بعض اَن پڑھ حضرات ایسے بھی تھے کہ قرآن کو دوسری عبارتوں سے تو کیا ، حدیث شریف سے بھی تمیز کرتے تھے ۔ ایک جاہل عربن نے قرآن شریف کو پڑھتے دیکھا تو پاس آ کر بیٹھ گئی اور ہمہ تن گوش ہوکر سننے لگی ۔ کسی نے پوچھا : یہ کیسا کلام ہے ؟ کہا میں تو جاہل ہوں کیا بتاؤں ، مگر اتنا ضرور کہوں گی کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک طبق ہے جس میں حلوا ہے ، نیچے شہد ہے اوپر مسکہ ہے ۔

قرآن کے معجز ہونے کا کون ادراک کرسکتا ہے ؟

واضح ہو کہ قرآن شریف متعدد اعتبار سے معجز ہے ۔ ان میں سے بعض اعتبار تو ایسے ہیں جن کو ہر شخص سمجھ سکتا ہے جیسے قرآن شریف کے الفاظ کا نغمہ اور اس کی دل کشی ۔ حضرت رسول مقبول ﷺ کا اُمی ہونا ، اور پھر ایسی بے مثل اور عجیب و غریب کتاب کا لانا جو دین و دنیا کے ہر قسم کے امور میں شمعِ ہدایت ہے ، یا قرآن شریف میں ماضی اور مستقبل کے اخبار یعنی اظہارِ مغیبات وغیرہ وغیرہ ۔ اب رہا قرآن شریف کا فصاحت و بلاغت کی رو سے معجز ہونا ۔ وہ ماہرین اور صحیح المذاق اہلِ زبان کو تو بالبداہت معلوم ہوجاتا ہے اور دوسروں کو غور و فکر اور استدلال سے ، دوسروں کے کلام سے مقابلہ کرنے سے ، اصولِ معانی و بیان و بدیع اور اسالیب کلام سے واقف ہونے سے ممکن ہے۔

قرآن کی کتنی مقدار معجز ہے ؟

بعض کہتے ہیں کہ پورا سورہ قرآن کا معجز ہے ، ایک دو آیتیں حدِ اعجاز کو نہیں پہنچتیں ۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سورہ اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ یا اس کا مماثل یعنی تین آیتوں کی مقدار بھی معجز ہے ۔

اسلُوب : امرأ القیس کے دیوان میں دو چار مختلف اشعار ان لوگوں کے لگادیں جو اس کے ہم پایہ ہیں تو ممکن ہے ، مگر مسلسل دو چار سے زیادہ اشعار ہرگز نہیں ملاسکتے ۔ کسی نے ابن المقنع سے کہا کہ آپ طویل قصیدے نہیں کہتے تو اس نے کہا کہ جاہلیت کا رنگ قائم رکھنا سخت مشکل ہے ۔

کوئی قرآن شریف اور حدیث شریف کو ملا کر دیکھے، حدیث کا اسلوب، قرآن کے اسلوب سے ہرگز نہیں ملتا۔ جو لوگ اسالیبِ کلام سے واقف ہوتے ہیں وہ فوراً کہہ دیتے ہیں یہ شعر، امرأ القیس کا ہے یا زہیر کا، زمانہ جاہلیت کا ہے یا ان لوگوں کا جنھوں نے اسلام اور جاہلیت دونوں کو پایا ہے یا یہ کہ یہ شاعر عہدِ بنی امیہ کا ہے یا بنی عباس کا یا بالکل زمانۂ حال کا۔ پھر یہ کہ یہ شاعر بغداد کا ہے کہ شام کا، حجاز کا ہے یا مصر کا، عرب کا ہے یا عجم کا۔ اگر ایک شعر سے پورا علم نہیں ہوسکتا تو دو چار شعر کے بعد تو امتیاز ہو ہی جاتا ہے، اردو داں بھی سمجھ لیتے ہیں کہ یہ شعر سوداؔ کا ہے یا میرؔ کا، ذوقؔ کا ہے یا غالبؔ کا، داغؔ کا ہے یا امیرؔ کا۔ ہر زبان کے نقادِ سخن شعراء و نظماء کے کلام میں امتیاز کرتے ہیں۔ اعلیٰ شعر کو ادنیٰ سے جدا کرتے ہیں۔ جہلِ مرکب، ہٹ دھرمی، بے جا مخالفت اور بات ہے۔ ذوقِ سلیم نہ رکھنے والے معرضِ بحث میں نہیں۔ صاحبِ ذوق، کلامِ عالی سنتا ہے اور پہروں بلکہ دنوں اس کا مزا لیتا ہے۔ ایسے صاحبِ ذوق، عرب بلکہ عجم پر بھی بلاشبہ قرآن کا اعجاز، فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔ احادیث شریف کے کمالِ فصاحت و بلاغت میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔ جس کی نسبت اس بہترین اور گرامی ترین ہستی کی طرف ہو جس کا ارشاد ہے: اُوْتِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ مگر قرآن شریف کچھ اور ہی شئے ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ قرآن شریف حضرت رسولِ مقبولؐ کا کلام نہیں، اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔

الغرض ہمارے سامنے صدیقِ اکبرؓ، فاروقِ اعظمؓ، مظہر العجائبؓ کے خطب ہیں۔ اللہ اور بندے میں جو فرق ہے وہی قرآن اور ان کے کلاموں میں ہے۔ خطبِ ابن نباتہ، مقاماتِ بدیعی یا حریری اور دوسروں کے کلام کی حقیقت ہی کیا ہے۔ ایک نادان کہتا ہے کہ حریری بھی اعلیٰ درجہ کی فصاحت کا مالک ہے، حقیقۃً اس نے کلامِ فصحاء دیکھا ہی نہیں، اس کو ڈھلی ہوئی اور سوہن کی ہوئی چیز میں تمیز نہیں، اس کو زندہ اور مردہ میں فرق نہیں۔ شریف مرتضیٰ کا کلام حریری سے زیادہ رتبہ رکھتا ہے۔ بدیعی کے اچھے فقرات کے سامنے پوری حریری دھری کی دھری رہ جاتی ہے۔

فطرت اللہ: دودھ کے اجزا معلوم ہوگئے، پانی، گھی، شکر، نمک اور کیا کیا، ذرا ان کو ملا کر دودھ تو بنادو، ناممکن۔ بہتر یا تہتر عناصر دریافت کرلئے گئے۔ اب کیا ہے۔ سب کچھ معلوم ہوگیا۔ ذرا ان عناصر کو جوڑ کر تتلی کا پر، تو بنادو، ذرا گلاب کے پھول کی ایک پنکھڑی ہی تو بنادو۔ ناممکن۔ مادہ، عناصر کا پیدا کرنا تو ایک طرف، ذرا خدا کی دی ہوئی کوئی صورت ہی تو بنادو۔ ناممکن، تمہارا کام آرٹی فشل، مصنوعی۔ خدا کا کام نیچرل، فطری۔ اپنی قدرت کا عجز، مادہ اور مادیات میں آزما چکے۔ اب ذرا تم جو بولتے ہو، وہی الفاظ لو، اور ان سے قرآن کی سورت کا ایک مثل بنادو۔ غیر ممکن، خارج از قدرت، بناوگے بھی تو وہی آرٹی فشل، مصنوی، ناقص، کہاں تصویر، کہاں صاحبِ تصویر، کہاں مردہ، کہاں زندہ۔

اَلفِیلُ مَا الفِیل وَما اَدرٰکَ ماالفِیلُ لَہٗ خُرطُومٌ طَوِیلٌ وَذَنَبٌ وَّبِیلٌ۔

کیا یہ ''اَلْقَارِعَۃُ'' کا جواب ہے؟ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ الْعَظِیْمَ۔ خانہ عقلت خراب! کیوں مسخرہ بنتا ہے۔ کیوں اپنے آپ پر لوگوں کو ہنساتا ہے۔ جس طرح خدا کا فعل معجز ہے اسی طرح اس کا قول بھی معجز ہے۔ تصویر یا مجسمہ بنا کر چڑیا کو دھوکا نہیں دے سکتے تو ان مہملات و واہیات سے، خرافات سے ہم کو دھوکا دے گا: اَعُوْذُ بِاللّٰہِ ہرگز نہیں، یہ سب الفاظ بلامعنیٰ ہیں، یہ تنِ بے جان ہے، مردار ہے، جا اور اس کو خاک میں دبا آ، خدا کا کام بندے کے کام سے بالکل علحدہ ہے۔ بالکل ممتاز ہے، اعجاز ہے اعجاز!

خدائی لہجہ : شاعر یا منشی جس درجہ کا ہوتا ہے اسی درجہ کا اس کا کلام ہوتا ہے ۔ ایک غمگین آدمی کے کلام سے غم ظاہر ہوگا ۔ ایک سپاہی کے کلام سے شجاعت ٹپکے گی ۔ متنبّی سیف الدولہ کے ساتھ خود بھی جنگ میں شریک رہتا تھا تو اس کے قصیدے کا زور ہی الگ ہے ۔ شعراءِ جاہلیت کے اشعار میں بے ساختگی ، سادگی اور صداقت ہے ، متمدن شعراء کے کلام میں صنائع و بدائع ہیں ، جن میں بناوٹ اور تکلف نمایاں ہے ۔ خدا کے کلام کا لہجہ اور قوت ہی الگ ہے ۔ اسی طرح پیغمبر اور بزرگانِ دین کا کلام الگ ہوتا ہے ، ادباء ، نمائشی لوگوں کا کلام جُدا جُدا ۔ صاحبِ فراست و عقلِ سلیم پہچان لیتا ہے کہ یہ کلام ، کلامِ بشر سے ماوراء ہے مَا هٰذَا مِنْ كَلَامِ الْبَشَرِ ۔

یکسانی : بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہر زبان میں ایک بڑا شاعر ہوجاتا ہے جس کی مثال مستقبل نہیں لاسکتا ۔ تو کیا وہ بھی کلام اللہ ہوجائے گا ۔ عربی میں امرأ القیس ، فارسی میں فردوسی ، اُردو میں میر تقی میرؔ یا آج کل غالب پرستوں کے پاس غالب یا بعض کے پاس میر انیسؔ یا یونانی میں ہومر اور انگریزی میں شیکسپیئر ۔

اس شخص کو سمجھنا چاہئیے کہ ان شعراء کی جو تعریف کی جارہی ہے وہ بحیثیتِ مجموعی ہے ، ان کی تعریف اس پیمانے پر نہیں ہے کہ کوئی ان کے تین شعر کے برابر بھی نہیں کہہ سکتا ۔ امرأ القیس کی کمزوریوں کو دیکھنا ہو تو اعجاز القرآن دیکھو ، غالب کا تمام دیوان چھان مارو ان میں سے چند ہی چوٹی کے شعر نکلیں گے ۔ سوداؔ ، داغؔ ، میرؔ کے کلام میں بھی چند اچھے شعر نکل سکتے ہیں ۔ مرزا دبیرؔ کے کلام میں چند بند بلکہ چند مرثیے ایسے ہیں جو میر انیسؔ کے بعض مراثی اور بند سے اچھے ہیں ۔ فردوسی ، نظامی ، سعدی ، خسرو ، جامی ، مولانا روم ، ان کے کلام میں اعلیٰ درجہ کے شعر بھی ہیں ، اوسط درجہ کے اور معمولی بھی ، ان میں سے کسی پر کسی کو ایسی ترجیح نہیں ہے کہ دوسرے کے چند شعر بھی ان کے اشعار کے برابر یا اعلیٰ نہ نکلیں ۔

مجھے انگریزی تو آتی نہیں ، مگر سنتا ہوں کہ شیکسپیئر کا ماخذ ، تاریخ اور دوسروں کے ڈرامے ہیں ۔ صرف دو ڈرامے اس کے ذاتی ہیں اور ان میں وہ کھو گیا ہے ۔ نیز ان کے کلام میں یکسانی کہاں ، عمر کے بڑھنے سے زمانے کے بدلنے سے ان ڈراموں میں تغیر آتا گیا ہے ، پھر نقادانِ سخن کی قدر اندازی سے بے چارے کے پرخچے اُڑ گئے ہیں ۔ اس کے سانٹ (sonnet) سے ملٹن کے سانٹ (sonnet) کچھ کم نہیں ۔ نفسِ فصاحت کے لحاظ سے بیکنؔ بھی ایک مسلمہ استاد ہے ، کون کہتا ہے کہ بیکن کی نثر شیکسپیئر کی نظم سے کم ہے ۔ بہرحال اگر شیکسپیئر اچھا ہے تو بیکن اور ملٹن بھی اچھے ہیں ۔ بن جان سن بھی اس کی ٹکر کا ہے ۔ یہ نہیں کہ شیکسپیئر کے سامنے سب ہیچ ہوگئے ہیں ۔ لبید نے جو شعراءِ سبعہ معلقہ میں سے ایک ہیں مسلمان ہوکر قرآن ہی پڑھتے اور اس پر سر دھنتے رہے ، شعر کہنا چھوڑ دیا ۔

جان سن اور ہومر کے متعلق بعض محققین نے لکھا ہے کہ کہیں ہومر نے اچھا لکھا ہے تو کہیں جان سن نے ، دنیا کے تمام شعراء اور خطباء میں کوئی ایسا نہیں جو دوسروں پر اتنی فوقیت رکھتا ہو کہ کسی کا ایک حصہ بھی اس کے کسی حصہ کے برابر نہ ہو ، اور اس کا تمام و کمال کلام ایک درجہ پر ہو یا اس کے دو قولوں میں تناقض نہ ہو ، یا اس کے کلام میں تغیر ممکن نہ ہو ۔ قرآن شریف کی یہ حالت ہے کہ اس میں سے ایک حرف نہ نکل سکتا ہے نہ زیادہ ہوسکتا ہے ، نہ جملے کی تبدیلی ہوسکتی ہے نہ ایک لفظ کی جگہ اس کا مترادف ہی رکھا جاسکتا ہے ۔

قرآن شریف کی تاثیر: حضرت عمرؓ رسول اللہ ﷺ سے لڑنے نکلے تھے، راستہ میں بہن کے گھر پہنچے۔ بڑے اصرار سے قرآن مانگا کہ دیکھیں، سورۂ طٰہٰ پڑھی تو دل میں اتر گیا۔ باطل کی تائید کے لئے چلے تھے۔ فاروقِ اعظم بن کر نکلے۔ عتبہ قریش کا ایک بڑا سردار تھا حضرت نے قرآن سنایا تو دونوں ہاتھ ٹیک دیئے اور لگا جھومنے اور آنسو بہانے۔ ولید نے سنا تو کہا: اِنَّ عَلَيْهَا طَلَاوَةٌ وَ فِيْهَا حَلَاوَةٌ؛ اس پر تازگی اور اس میں حلاوت ہے۔ ابوجہل نے پوچھا کہ اتنے بڑے سردار ہوکر ایک بچہ کی باتوں میں آگئے اور تعریف بھی کرنے لگے، عربوں پر تمہاری اس تعریف کا بڑا اثر ہوگا، تم کو قرآن کی ہجو اور اس پر اعتراض کرنا چاہئیے۔ ولید نے کیا کہا؟ اِنَّهٗ فَكَّرَ وَ قَدَّرَ۔ اس نے سوچا اور اٹکل دوڑائی۔ فَقُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ: اس کو خدا کی مار، کیسی اٹکل دوڑائی۔ ثُمَّ قُتِلَ كَيْفَ قَدَّرَ۔ پھر اس کو خدا کی مار، کیسی اٹکل دوڑائی، کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ ثُمَّ نَظَرَ ثُمَّ عَبَسَ وَ بَسَرَ؛ پھر غور کیا (مگر کوئی بات دل کو نہ ٹھکی) پھر تیوری چڑھائی اور برا سا منہ بنالیا۔ ثُمَّ اَدْبَرَ وَاسْتَكْبَرَ۔ پھر پیٹھ پھیرلی (اور اعتراض نہ کرنے کو اپنے لائق نہ سمجھا) اور شیخی میں آ گیا۔ فَقَالَ اِنْ هٰذَا اِلَّا سِحْرٌ يُّؤْثَرُ پھر کہنے لگا یہ تو بس جادو ہے جو نقل کیا جاتا رہے گا۔ کہیں رکتا نظر نہیں آتا۔

کوئی اس کے جواب پر غور کرے کہ اس نے زبان داں فصیح و بلیغ ہونے کے لحاظ سے قرآن کی فصاحت و بلاغت پر کیا اعتراض کیا کچھ نہیں، بس چلتا جادو کہہ دیا۔ ظاہر ہے کہ انسان جب کسی چیز کو طاقتِ بشری سے خارج دیکھتا ہے تو کہتا ہے یہ تو جادو ہے۔ طاقتِ بشری سے خارج تو اس نے مان ہی لیا۔ ہاں معجزہ کے عوض جادو کہہ دیا۔ کیا وہ جادوگر تھا؟ جادو کی حقیقت سے واقف تھا، کچھ نہیں، جس فن کا وہ تھا، جس کا وہ ماہر تھا اس میں تو وہ مان گیا کہ قرآن کا مثل طاقتِ بشری سے خارج ہے، جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے۔

ایک اور نوعِ تاثیر ہے جو ظلماتِ مادیت میں پھنسے ہوئے شخص کو نظر نہیں آتی، اور وہ قضائے مقصد و دفعِ امراض اور دفعِ مَسِ خبائث ہے۔ اس کے لئے بونی کی شمس المعارف، مرقع شریف اور دیگر کتب دیکھو، ان عملیات میں سب سے اعلیٰ اور قوی الاثر عمل، آیاتِ قرآنیہ کا ہے۔ میں ایک علمی آدمی ہوں، تعلیم میرا کام ہے مگر دن بھر میں کتنے لوگوں کو جن کو میں کوئی آیت مبارکہ بتا دیتا ہوں فائدہ ہوتا ہے۔ ہزار تاثیر کی ایک تاثیر یہ ہے کہ اس وقت قرآن شریف کی تعلیم کے تاثیر سے تیس بتیس کروڑ آدمی حلقہ بگوش اسلام ہیں۔

مسلمانوں کی غفلت کی وجہ ہے کہ قرآن کی تبلیغ کا برابر انتظام نہیں ورنہ قرآن نور بن کر آنکھوں میں گھستا ہے اور روح بن کر دل و دماغ میں بستا ہے۔ میرے پاس تو قرآن کا مقصدِ اعظم اور اس کا اعجازِ مجسم، تعلیم ہے۔ ارسالِ رُسل کی غایت، تعلیم ہی ہے۔ دوسرے سب توابع ہیں، مگر قرآن کے مقصد کے توابع بھی دوسروں کے مقاصد کے مقابل اعجاز ہی اعجاز ہیں۔

مخارجِ حُروف

امام جزری کے یہ اشعار یاد کرنے سے مخارج اور صفاتِ حروف میں امتیاز کرسکتے ہیں۔

مَخَارِجُ الْحُرُوْفِ سَبْعَةَ عَشَرَ عَلَى الَّذِىْ يَخْتَارُهٗ مَنِ اخْتَبَرَ

حروف کے مخارج سترہ ہیں ۔ ان لوگوں کے خیال کے مطابق جو تجربہ کار ہیں اور اس کو پسند کرتے ہیں ۔ یہ بات یاد رکھو کہ ایک مخرج سے دو آوازیں اور دو مختلف مخارج سے ایک آواز نہیں نکل سکتی ۔ امام جزری نے جو کچھ فرمایا ہے وہ تقریباً یہ ہے :

فَاَلِفُ الْجَوْفِ وَاُخْتَاهَا وَهِیْ حُرُوْفُ مَدٍّ لِّلْهَوَآءِ تَنْتَهِیْ

الف اور اس کی دونوں بہنیں یعنی ''و'' ماقبل مضموم اور ''ی'' ماقبل مکسور ، جوف یعنی اس خلو سے نکلتے ہیں ، جو ناف سے ہونٹوں تک ہے ، اور ہوا ہی پر ختم ہوتے ہیں ۔

ثُمَّ لِاَقْصَی الْحَلْقِ هَمْزُهَاءُ ثُمَّ لِوَسْطِهٖ فَعَیْنٌ حَاءُ

حلق کے تین حصّے کئے گئے ہیں ۔ اقصٰی حلق یعنی انتہائی حصہ ناف کی طرف کا ، یہاں سے دو حرف نکلتے ہیں ۔ ''ھمزہ'' اور ''ھاء'' اور بیچ حلق سے ''ع'' اور ''حاء'' نکلتے ہیں ۔

اَدْنَاهُ غَیْنٌ خَاؤُهَا وَالْقَافُ اَقْصَی اللِّسَانِ فَوْقُ ثُمَّ الْكَافُ

اَسْفَلُ وَالْوَسْطُ فَجِیْمُ الشِّیْنُ یَا وَالضَّادُ مِنْ حَافَتِهٖ اِذْ وَلِیَا

اَلْاَضْرَاسُ مِنْ اَیْسَرَ اَوْ یُمْنَاهَا وَاللَّامُ اَدْنَاهَا لِمُنْتَهَاهَا

منہ کے جانب قریب سے ''غ'' اور ''خا'' نکلتے ہیں اور ''ق'' زبان کے انتہائی حصہ یعنی حلق کے قریب مقام سے اور زبان کے اوپر کے حصّے سے نکلتا ہے اور کاف ۔ ق کے مخرج سے اسفل یعنی کچھ اوپر ۔ بہ نسبت ''ق'' کے ''ک'' ذرا اندر سے نکلتا ہے ۔ زبان کے وسط یعنی درمیانی حصّے سے ''ج'' اور ''ش'' اور ''ی'' ماقبل مفتوح نکلتے ہیں اور ''ض'' زبان کے حافہ یعنی کنارے سے جب کہ وہ داڑھوں سے ملے ہوئے ہوں ، خواہ سیدھی جانب سے یا بائیں جانب سے یعنی زبان کے کنارے کو داڑھوں سے لگائیں تو ''ض'' نکلتا ہے خواہ سیدھی طرف لگائیں یا بائیں طرف مگر بائیں طرف زیادہ سہولت ہوتی ہے اور ''ل'' زبان کے اندر کے حصّے سے آخر تک یعنی ''ل'' زبان کی نوک اور اوپر کی داڑھوں کے مسوڑھوں سے نکلتا ہے ۔

وَالنُّوْنُ مِنْ طَرْفِهٖ تَحْتُ اجْعَلُوْا وَالرَّاءُ یُدَانِیْهِ لِظَهْرٍ اَدْخُلُ

''نؔ'' کا مخرج ''لؔ'' کے مخرج سے اور اندر ہے اور رؔا اس کے قریب ہے ۔ غرض کہ ''لؔ'' اور ''نؔ'' اور ''رؔا'' یہ سب زبان کی نوک اور اوپر کے دانتوں کے مسوڑھوں سے نکلتے ہیں ۔

وَالطَّاءُ وَالدَّالُ وَتَا مِنْهُ وَمِنْ عُلْیَا الثَّنَایَا وَالصَّفِیْرُ مُسْتَكِنْ

فِی السِّیْنِ وَالصَّادِ كَذَا مِنْ حَرْفِ زَا مِنْهُ وَمِنْ فَوْقِ الثَّنَایَا السُّفْلٰی

طؔا اور دؔ اور تؔا زبان کی نوک اور اوپر کے دانتوں سے اور صفیر یعنی سیٹی چھپی ہوئی ہے ۔ سؔ ۔ صؔ اور زؔ میں جو زبان کی نوک اور سامنے کے نیچے کے دانتوں کے اوپر سے نکلتے ہیں ۔

وَالظَّاءُ وَالذَّالُ وَثَّا لِلْعُلْیَا بِالْجِدِّ مِنَّا تَسْتَوِیْ فِیْهَا الْاَدَا

اور ظؔا اور ذؔ اور ثؔا ثنائے علیا یعنی اوپر کے چار دانتوں سے نکلتے ہیں ۔

مِنْ طَرَفَیْهِمَا وَمِنْ بَطْنِ الشَّفَهْ فَالْفَامَعَ الْحُرُفِ الثَّنَایَا الْمُشْرِفَهْ

اور فا ان کے دونوں جانب ہونٹ کے اندر کے دانتوں کے کناروں کے ساتھ ۔

لِلشَّفَتَيْنِ وَاوُ بَا وَمِيْمُ وَغُنَّةٌ مَخْرَجُهَا الْخَيْشُوْمُ

دونوں ہونٹوں سے واوؔ باؔ اور میمؔ نکلتے ہیں، اور غنہ کا مخرج خیشوم یعنی ناک کے اندر ہے۔

صفاتِ حُروف

صِفَاتُهَا جَهْرٌ وَّرِخْوٌ مُّسْتَفِلْ مُنْفَتِحٌ مُّصْمِتَةٌ وَّالضِّدُّقُلْ

صفاتِ حروف حسبِ ذیل ہیں:

(۱) مہموسہ کی ادائی میں سانس جاری رہتا ہے۔ ہلکی سی ہائے مختفی کی سی آواز معلوم ہوتی ہے۔ اس کے مقابل (۲) مجہورہ ہے۔ اس کی ادائی میں سانس بند ہوجاتا ہے۔ (۳) شدیدہ کی ادائی قوت سے ہوتی ہے، اس کے مقابل (۴) رخوہ ہے اس کی ادائی میں نرمی ہوتی ہے۔ (۵) مستعلیہ کی ادائی میں زبان تالو کی طرف اُٹھتی ہے۔ اس کے مقابل (۶) مستفلہ ہے۔ اس کی ادائی میں زبان نیچے رہتی ہے۔ (۷) مطبقہ اس میں زبان تالو سے بہت ہی نزدیک ہوجاتی ہے۔ (۸) منفتحہ اس کے مقابل ہے۔ اس میں زبان تالو سے ذرا دور رہتی ہے۔ (۹) مذلقہ ان حروف کی ادائی کے وقت سہولت اور تیزی سے حروف ادا ہوجاتے ہیں۔

ہم نے اصل صفات اور ان کے اضداد دونوں بیان کردیئے ہیں۔ اب ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ حروف ہیں کون کون سے۔

مَهْمُوْسُهَا فَحَثَّهُ شَخْصٌ سَكَتْ شَدِيْدُهَا لَفْظُ اَجِدْ قَطٌ بَكَتْ

مہموسہ حروف کا مجموعہ ان حروف (فحثہ، شخص، سکت) میں ہے۔ شدیدہ کے الفاظ (اجد قط بکت) ہیں۔

وَبَيْنَ رِخْوٍ وَّ شَدِيْدٍ لِنْ عُمَرْ وَسَبْعُ عُلْوٍ خُصَّ ضَغْطٍ قِظْ حَصَرَ

رخوہ اور شدیدہ کے درمیان متوسطہ حروف کا مجموعہ (لن عمر) ہے، اور سات مستعلیہ ہیں جن کا مجموعہ (خص ضغط قظ) ہے

وَصَادٌ ضَادٌ طَاءٌ ظَاءٌ مُطْبِقَهْ وَفَرَّ مِنْ لُبِّ حُرُوْفُ الْمُذْلِقَهْ

صادؔ، ضادؔ اور طاءؔ مطبقہ ہیں، اور (فرمن لب) کا مجموعہ حروف مذلقہ ہیں۔

صَفِيْرُهَا صَادٌ وَزَاءٌ سِيْنُ قَلْقَلَةٌ قُطْبُ جَدٍّ وَّ اللِّيْنُ

صؔ، سینؔ اور زاءؔ ان تینوں حروف میں صفیر یعنی سیٹی ہے۔ حروفِ قلقلہ کا مجموعہ (قطب جد) ہے۔ اس کی ادائی میں زبان کو جھٹکا لگتا ہے اور سانس بند ہوجاتا ہے۔ قاری کو چاہیئے کہ استاد سے ان حروف کی ادائی سیکھے اور ہر ایک حرف کو اس کے مخرج اور صفات خاصہ کے ساتھ ادا کرنے کی کوشش کرے۔ خصوصاً جب کہ آخر کا حرف مشدد ہو جیسا تَبَّ لوگ سہل انگاری کرتے ہیں اور مشدد حرف اور اکیلے حرف میں فرق نہیں کرتے۔

وَاوٌ يَاءٌ سَكَنَا وَانْفَتَحَا قَبْلَهُمَا وَالْاِنْحِرَافُ صَحِّحَا

لین کے حروف واوٗ، یائے ساکن ماقبل مفتوح ہیں جیسے سَوْءٌ۔ سَيْفٌ۔

فِي اللَّامِ وَالرَّاءِ بِتَكْرِيْرٍ جُعِلْ لِلتَّفَشِّي الشِّيْنُ ضَادُ اِسْتَطِلْ

اور انحراف، لامؔ میں ہے یعنی لؔ کی ادائی میں زبان مخرج میں کچھ پلٹ جاتی ہے اور راءؔ میں تکرار ہے مگر زبان خوب

حرکت کرتی ہے اسے روکنا چاہئیے اورش میں تفشی ہے ۔ یعنی زبان پرشؔ خوب پھیلتی ہے اورضؔ کا مخرج بڑا ہی لمبا ہے کیونکہ پوری زبان کے کنارے اور ایک طرف کے پورے داڑھوں سے ادا ہوتا ہے ۔

(۱)

ا ۔ با ۔ تا ۔ ثا ۔ جا ۔ حا ۔ خا ۔ دا ۔ ذا ۔ را ۔ زا ۔ سا ۔ شا ۔ صا ۔ ضا

طا ۔ ظا ۔ عا ۔ غا ۔ فا ۔ قا ۔ کا ۔ لا ۔ ما ۔ نا ۔ وا ۔ ھا ۔ ءا ۔ یا ۔

(۲)

ا ۔ ابْ ۔ اتْ ۔ اثْ ۔ اجْ ۔ احْ ۔ اخْ ۔ ادْ ۔ اذ ۔ ار ۔ از ۔ اسْ ۔ اشْ ۔ اصْ ۔

اض ۔ اطْ ۔ اظ ۔ اع ۔ اغ ۔ افْ ۔ اقْ ۔ اکْ ۔ ال ۔ ام ۔ ان ۔ او ۔ اہْ ۔ ای ۔

(۳)

منْ ا ۔ منْ با ۔ منْ تا ۔ منْ ثا ۔ منْ جا ۔ منْ حا ۔ منْ خا ۔ منْ دا ۔ منْ ذا ۔ منْ رّا ۔

منْ زا ۔ منْ سا ۔ منْ شا ۔ منْ صا ۔ منْ ضا ۔ منْ طا ۔ منْ ظا ۔ منْ عا ۔ منْ غا ۔

منْ فا ۔ منْ قا ۔ منْ کا ۔ منْ لّا ۔ منْ مّا ۔ منْ نّا ۔ منْ وّا ۔ منْ ھا ۔ منْ ءا ۔ منْ یّا ۔

صاحبو ! ایک صاحب نے مجھ سے پوچھا کہ قرآن شریف میں زیر، زبر، کس زمانے میں لگائے گئے ہیں ۔ میں نے کہا حجاج بن یوسف کے زمانے میں ۔ انہوں نے کہا : اگر زیر زبر غلط لگائے جائیں تو کیا معنٰی نہیں بدل جائیں گے ؟ میں نے کہا قرآن شریف کا پڑھنا کتابت پر موقوف نہیں ہے ۔ رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے اب تک ''عَنْ فلان بن فلان '' سننے پر موقوف ہے ۔ آپ کے خیال میں قرآن آنکھوں سے پہنچتا ہے اور ہمارے خیال میں کانوں سے ، روایت کے علاوہ تلفظ ، مخارجِ صفات حروف ، یہ سب کچھ استاد ہی سے سننے پر موقوف ہیں ۔

میں اپنے طالبِ علموں کو تین پٹیاں حسبِ متذکرہ بالا صاف کرواتا ہوں ۔ پہلی پٹی ا ۔ بَا ۔ تا وغیرہ ، اس سے مخارجِ حروف خوب صاف ہوجاتے ہیں ۔

دوسری پٹی ا ۔ اب ۔ ات وغیرہ اس سے حروف کی صفات کے ادا کرنے میں بڑا فائدہ ہوتا ہے ۔

تیسری پٹی من ا ــ من با ــ من تا وغیرہ جس سے اظہار ، ادغام ، اخفا کی مشق ہوجاتی ہے ، اس میں حسبِ ذیل علامتیں لگاتا ہوں '' ں '' اخفا کی علامت ، تشدید '' ّ '' ادغام کی علامت ہے ، نون ساکن بَا سے پہلے مَ سے بدل جاتی ہے جسے قلب کہتے ہیں ۔ '' غـ '' غنہ کی علامت ہے ، '' بغ '' ادغام بلاغنہ کی علامت ہے ۔ '' ظ '' اظہار کی علامت ہے ۔ '' را '' کے متعلق ترقیق کے لئے '' ر '' کی علامت اور تفخیم کے لئے '' فـــخ '' کی علامت ہے ۔ مدِّ متوسط کے لئے دو کا ہندسہ دیتا ہوں ، اور مدِّ طویل کے لئے تین/۳ کا ہندسہ ۔

میں عادتاً طلبہ سے اول '' اَلَمْ تَرَ کَیْفَ '' (سورہ فیل) سے آخر تک کئی دن تک سنتا رہتا ہوں ۔ جب وہ اچھا پڑھنے

لگتے ہیں تو ''والضُّحٰی'' سے آخر تک چند روز تک سنتا رہتا ہوں ۔ پھر پارۂ عم کئی روز تک سنتا رہتا ہوں ۔ اس عرضِ مدت میں طالبِ علم اچھی طرح پڑھنے لگتا ہے اور کافی مشق ہوجاتی ہے۔ پھر قرآنِ مجید شروع سے آخر تک سنتا ہوں ۔

صاحبو! لفظِ اللہ سے پہلے فتح یا ضمہ ہوتو لؔ کو پُر یعنی موٹا یا مفخّم پڑھنا چاہئیے ۔ جیسے قَالَ اللّٰہُ ۔ یَقُوْلُ اللّٰہُ اگر لفظ اَللّٰہُ سے پہلے زیر یا کسرہ ہوتو اس کو باریک ، مرقق پڑھنا چاہئیے ۔ جیسے لِلّٰہِ ۔ بِسْمِ اللّٰہِ ۔

صاحبو! رؔا پر زبر یا پیش ہوتو اس کو پُر یعنی موٹا پڑھنا چاہئیے، جیسے رَسُوْلُ ۔ رُسُلٌ ۔ اگر رؔا ساکن ہوتو اس سے پہلے حرف کو زبر یا پیش ہوتو اس کو بھی پُر یا موٹا پڑھنا چاہئیے ۔ مثلاً اَرْسَلَ ۔ اگر رؔا ساکن ہو اور اس کے ماقبل بھی ساکن ہوتو اس سے پہلے حرف کو دیکھنا چاہئیے اور یہ دو ساکن ، حالتِ وقف میں ہوتے ہیں جیسے نَارْ ۔ نُوْرْ ۔ جب رؔا کو زیر ہوتو اس سے پہلے حرف پر زبر یا پیش ہوتو اس رؔاء کو حالتِ وقف میں موٹا پڑھیں گے ، جیسے شَرِّ ، بُرِّ اور وصل کی حالت میں خود اس کی حرکت کا اعتبار کرکے باریک پڑھیں گے ۔ اگر رؔا ساکن ہو اور اس سے پہلے حرف کو زیر ہو اور بعد کا حرف مستعلیہ یا مطبقہ یعنی ''وَسَبْعُ عُلْوٍ'' میں کا کوئی ایک حرف ہو اور مطبقہ یعنی ص ، ض ، ط ، ظ میں کا کوئی ایک حرف ہوتو رؔاء کو موٹا پڑھنا چاہئیے جیسے فِرْقَطٍ مِرْصَادٍ ۔ قِرْطَاسٍ مستعلیہ حروف میں سے کوئی حرف اگر دوسرے کلمہ میں ہوتو رؔاء کو باریک ہی پڑھنا چاہئیے جیسے لَا تُصَعِّرْ خَدَّکَ ؛ لفظ فِرقٍ میں یعنی جب ق کو زیر ہوتو موٹا پڑھنا بھی جائز ہے اور باریک بھی ۔

اگر رؔاء ساکن ہو اور اس سے پہلے کا حرف بھی ساکن ہو اور اس سے پہلے کے حرف کو زیر ہوتو باریک پڑھنا چاہئیے ۔ جیسے سِحْرٍ ۔ حِجْرٍ ۔ رؔاء کو کسرہ عارضی ہوتو رؔاء کو موٹا پڑھنا چاہئیے ۔ جب رؔاء کو پیش یا زیر ہو اور اس سے پہلے یائے ساکن ہوتو ملانے میں موٹا اور حالتِ وقف میں باریک پڑھا جائے گا جیسے خَیْرٌ ۔ خَیْرٍ ۔

قرآن کے متن پر علاماتِ تجوید

قرآن کے متن پر حسبِ ذیل علاماتِ تجوید لگائی گئی ہیں ۔ جن سے قرآن کے صحیح اور مطابق قواعدِ تجوید پڑھنے میں مدد ملتی ہے :-

(خ) علامتِ اخفاء : نونِ ساکن کو دراز کرتے ہیں تاکہ بعد کے حرف میں وہ مخفی ہوجاتے جیسے مَنْ قَالَ ۔

(ظ) علامتِ اظہار : نونِ ساکن کو ایسا واضح اور مختصر طور سے ادا کریں کہ بعد کے حرف کی بو تک نہ آئے مثلاً مِنْ عِلْمٍ ؛ یہ علامت چھ حروفِ حلقی یعنی ء ۔ ھ ۔ ع ۔ ح ۔ غ ۔ خ سے پہلے دی جاتی ہے ۔ بعض دفعہ نون ساکن کے سوائے دوسرے حرفوں پر بھی یہ علامت دی گئی ہے ، مقصد یہ ہے کہ اس حرف کو واضح کرکے پڑھا جائے اور بعد والے حرف میں غلطی سے ملا نہ دیا جائے جیسے لَقَدْ جَاءَ کُمْ کہ لوگ غلطی سے لَقَجَّآءَ کُمْ پڑھ دیتے ہیں ۔ جو غلط ہے ۔

(غ) علامتِ غنہ : ''یرملون'' کے حروف سے پہلے نونِ ساکن کو بعد کے حرف میں ادغام بھی کرتے ہیں اور غنہ بھی بجز حروف لؔ اور رؔا کے ۔ نیز میؔم ساکن کو باؔ سے پہلے غنہ کرتے ہیں ۔ مگر غنہ ہے کیا ؟ حرف کی ادائی کے وقت ناک میں سے آواز نکالنا ، جیسے مَنْ یَّقُوْلُ ۔ مِنْ یَّوْمٍ ۔

(بغ) علامتِ ادغام بلاغنہ : یہ حروفِ لؔ اور رؔا میں ہوتا ہے ۔ مثلاً : وَلَمْ یَکُنْ بغ لَّہٗ ۔ مُحَمَّدٌ بغ رَّسُوْلُ اللّٰہِ ۔

(م) علامتِ قلب : نونِ ساکن باؔ سے پہلے میم میں منقلب ہوجاتا ہے مثلاً اَنْبِیَآءَ ۔

(۳) علامتِ مدِّ طویل : یہ اس لئے دی جاتی ہے کہ لوگ مدِّ طویل اور مدِّ متوسط میں فرق نہیں کرتے جیسے الٓمٓ۔ مدِ طویل تین الف کے برابر ہوتا ہے اور مدِّ متوسط دو الفوں کے برابر۔

(×) علامتِ چلیپا : بعض دفعہ الف یا ہمزہ مطلقاً پڑھا نہیں جاتا مثلاً لَآ اِلَى اللّٰهِ تُحْشَرُوْنَ میں الف اُوْلُوا اور اُوْلٰٓئِكَ میں واوٗ۔

( ) علامتِ ہمزۂ وصل : یہ ہمزہ ، وصل میں گر جاتا ہے اور ابتداء میں پڑھا جاتا ہے۔ جیسے وَ اُتُوْنِیْ میں اِیْتُوْنِیْ اور وَ أُتُمِن اُوْ تُمِنَ ہوگا۔

(0) علامتِ بیضہ : بعض دفعہ الف وقف میں پڑھا جاتا ہے اور وصل کی حالت میں پڑھا نہیں جاتا۔ جیسے اَنَا میں بحالتِ وقف الف پڑھا جائے گا ، اور بحالتِ وصل صرف فتحہ۔ اسی طرح سَلَا سِلَا وَاغْلَالَا میں وقف کی حالت میں الف پڑھا جائے گا اور وصل کی حالت میں صرف فتحہ رہے گا اور الف پڑھا نہ جائے گا جیسے سَلَاسِلَ اور اَنَ۔

(ّ) تشدید : قرآن شریف میں ایک جگہ يَلْهَثْ ذٰلِكَ ہے یعنی بحالتِ وقف ثَا رہتا ہے اور وصل کی صورت میں ثَا ذال میں مدغم ہوجاتا ہے اس لئے ذال پر تشدید (ّ) دے دی جاتی ہے۔ اسی طرح ایک مقام پر اَلَمْ نَخْلُقْكُّمْ میں ك پر تشدید دی جاتی ہے اور ق پڑھا نہیں جاتا۔

(شم) علامتِ اشمام : قرآن شریف میں ایک جگہ اشمام واجب ہے مثلاً مَالَكَ لَا تَاْمَنَّا اس لفظ کی ادائی میں ''ن'' پر اشمامِ ضمہ ضروری ہے۔ اس کی علامت ''شم'' ہوتی ہے۔

(ے) علامتِ امالہ : جس میں یائے مجہول کی آواز نکلتی ہے مثلاً بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖهَا وَمُرْسَاهَا۔

قرآن کی روایت وحفاظت

اب ہم قرآن کی روایت اور اُس کی حفاظت کے متعلق گفتگو کریں گے۔ رسولِ خدا ﷺ کی عادت تھی کہ آزاد لوگوں کے سوائے بھی جو اسیرانِ جنگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے اُن کو آزاد کر کے مختلف مقامات میں متعین فرماتے کہ عام لوگوں کو لکھنا پڑھنا سکھائیں۔ خصوصاً قرآن شریف ، جو سب سے زیادہ اہم ہے ، اس کی تعلیم دیں۔ اس طرح قرآن شریف عام مسلمانوں میں شائع و ذائع ہوگیا۔ خود حضرتؐ کے زمانے میں قرآن کے سینکڑوں حافظ تھے۔ قرآن شریف کی روایت کرنے والے ، سبع قراءات والے اور عشرہ قراءات والے تھے اور اب بھی ہیں اور یہ سلسلہ برابر جاری ہے۔ جو لوگ قرآن میں کمی زیادتی کے مدعی ہیں وہ بلا تحقیق منافقوں اور دشمنانِ اسلام کے خیالات بیان کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے :

اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ''ہم نے قرآن اتارا ، اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں''۔

جھوٹی روایتیں گھڑنے والے اصل میں قرآن کے ''وَاِنَّالَهٗ لَحٰفِظُوْنَ'' پر ایمان نہیں رکھتے۔ دنیا کی مذہبی کتابیں رکھنے والے متواتر تو کجا ، خبرِ آحاد سے بھی اپنی ایک روایت کو ثابت نہیں کر سکتے۔ تورات ، انجیل ، متعدد اوقات میں ، ظالم بادشاہوں کے زمانہ میں ، مثلاً بختِ نصر کے زمانے میں ، جلا دیئے گئے۔ کسی کو کچھ یاد رہ گیا تو اس نے لکھ لیا۔ ان آسمانی کتابوں کو دیکھو۔ اصل کتاب تو کیا ملے گی ، اور اس کا ثبوت کیا دیں گے ، ان ترجموں کو بھی دیکھو ، مختلف زمانوں میں ہر تھوڑے عرصہ کے بعد

ان کی اصلاح کی جاتی ہے۔ ان کتابوں میں کیا کیا نا قابلِ قبول روایتیں ہیں۔ معصوم پیغمبروں پر کس قدر جھوٹ باندھا گیا ہے۔ مثلاً لوط علیہ السلام کی نرینہ اولاد نہ تھی، تو اُن کی بیٹیوں نے اُن کو شراب پلا کر ناجائز اولاد حاصل کی۔ استغفراللہ!

قرآن کو دیکھو ابتداء سے لے کر اب تک ایک لفظ کی کمی زیادتی نہیں۔ مزید حفاظت اس طرح کی گئی کہ تراویح میں قرآن شریف پڑھا جاتا ہے، ذرا بھی غلطی ہوتی ہے تو سامع لقمہ دیتا ہے کہ صحیح یہ ہے۔ سبع اور عشرہ کی روایت چاہتے ہو، تو میرے دوست قاری کلیم اللہ حسینی اور قاری روشن علی صاحب سے اس کی روایت حاصل کرو۔ میں تو صرف حیدرآباد دکن کا ذکر کررہا ہوں۔ روئے زمین پر ہزارہا بلکہ لاکھوں حافظ ہیں، قراء ہیں جو قرآن شریف کی روایت اور حفاظت کر رہے ہیں۔ فقیر عبدالقدیر کو قرآن شریف حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، زید بن ثابتؓ، عبداللہ بن مسعودؓ اور ابی بن کعبؓ سے پہنچا ہے۔ جس کی روایت موجود ہے، اور پچاس سال سے لوگ میرے پاس قرآن شریف پڑھتے ہیں اور اس کی روایت کرتے ہیں۔ قرآن شریف کی حفاظت تو اس طرح کی گئی ہے کہ زیر زبر تو کجا، تلفظ اور مخارج کی بھی غلطی باقی نہیں رہتی۔

اچھا سبع اور عشرہ میں جو کچھ اختلاف ہے، یہ کیسے ہے؟

بات یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں عربوں کے مختلف قبیلے تھے، اور اب بھی ہیں۔ ہر ایک قبیلے کے پڑھنے میں تھوڑا تھوڑا فرق تھا، ہر ایک قبیلہ والا اپنی زبان کے مطابق پڑھتا اور رسول اللہ ﷺ نے اس کے ایسے پڑھنے کو جائز رکھا۔ مگر یاد رکھو ان سب قراءتوں سے معنٰی میں کوئی تغیر نہیں آتا۔ نیز رسول اللہ ﷺ ہر رمضان میں جبرئیل علیہ السلام کے ساتھ قرآن شریف کو دہراتے۔ اسی واسطے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اُنْزِلَ الْقُرْاٰنُ عَلٰی سَبْعَةِ اَحْرُفٍ''۔

صاحبو! سبع کا لفظ عربی زبان میں کثیر اور متعدد کے معنٰی میں ہے۔ جو حضرات سبع کے لفظ پر اڑے ہوئے ہیں ان کی اس کے بیان کرنے میں مختلف رائیں ہوگئی ہیں، جن کی تعداد چالیس سے بھی زیادہ ہے۔

قرآن شریف میں ''سَبْعَ سَنَابِلَ'' اور سَبْعَةُ اَبْحُرٍ ''سَبْعَةِ اَیَّامٍ'' بھی ہے۔ ''سَبْعَ لَیَالٍ'' بھی ہے۔ سَبْعٌ کے معنٰی اگر متعدد اور کثیر کے لیں تو اس کے نبھانے میں کوئی دقت اور دشواری نہیں۔

کیا وجہ ہے کہ دوسری اور قراءتوں اور روایتوں سے زیادہ حفصؒ کی روایت مشہور ہوگئی ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ حفصؒ کی قراءت میں قریش کی زبان سے جو فصیح ترین زبان ہے بہت کم فرق ہے۔

صاحبو! قرآن شریف کا اگر صحیح تلفظ نہ کیا جاے تو معنٰی کچھ کے کچھ ہوجاتے ہیں مثلاً اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ کی بجائے اگر اَلْھَمْدُ ہائے ہوز سے پڑھا جائے تو معنٰی ہوں گے: ''آگ بجھانا اللہ کے لئے ہے''۔ اگر عَالَمِیْنَ کو اَلَمِیْنَ یعنی بجائے عین کے ہمزہ سے پڑھا جائے تو اس کے معنٰی تو رنج والم کے ہوں گے۔ رَھْمَان اور رَھِیْمُ تو بے معنٰی ہیں۔ نَعْبُدُ کو اگر نَابُدُ پڑھیں تو معنٰی بھاگنے اور کراہت کرنے کے ہوں گے۔ نَسْتَعِیْنُ کو اگر نَسْتَأْیِنُ پڑھیں تو اس کے معنٰی رنج اور تکلیف کے ہوں گے۔ ضَآلِّیْن کو ؔ د سے پڑھیں تو معنٰی ہے: ہدایت کرنے والے، یعنی ان کا راستہ نہ بتا جو ہدایت کرنے والے ہیں۔ میرے دوست پروفیسر الیاس برنی نے اس مسئلہ کو بہت تفصیل سے بیان کیا۔

اُصولِ تاویل

واضح ہو کہ بعض مسائل میں معنٰی الفاظ کے تابع ہوتے ہیں اور بعض میں الفاظ معنٰی مقصود بالذات ہوتے ہیں۔ نقلیات

یعنی قرآن و حدیث و قانون میں لفظ مقدم ہے ، الفاظ سے جیسے معنٰی نکلتے ہیں وہی مراد لئے جاتے ہیں ۔ فلسفہ میں معنی مقدم ہیں ۔نقلیات میں تقسیماتِ اربعہ کا جاننا ضروری ہے ۔

تقسیمات الفاظ و معانی کے لحاظ سے نقلیات کی چار قسمیں ہیں :

(۱) باعتبارِ وضعِ لغت ۔ خاص ، عام ، مشترک ، ماوّل ۔

(۲) باعتبارِ استعمال ، معنائے وضعی وغیر وضعی میں ۔ حقیقت ، مجاز ، صریح ، کنایہ ۔

(۳) باعتبارِ ظہور و خفائے معنٰی ، جن کو متقابلات کہتے ہیں ۔

باعتبارِ ظہور ۔ ظاہر ، نص ، مفسر ، محکم

باعتبارِ خفاء ۔ خفی ، مشکل ، مجمل ، متشابہ

(۴) باعتبارِ کیفیتِ دلالت ۔ عبارۃ النص ، اشارۃ النص ، دلالۃ النص ، اقتضاء النص ۔

خاص وہ لفظ جو معنائے واحد کے لئے وضع کیا گیا ہو ۔

خاص کی تین قسمیں ہیں : (۱) خاصِ شخص (۲) خاصِ نوع (۳) خاصِ جنس ۔

(۱) خاصِ شخص : جو بہت سے افراد پر صادق نہ آئے ، جیسے زید ۔ اسی کو منطقی ، جزئی حقیقی کہتے ہیں ۔

(۲) خاصِ نوع : وہ کلی جو متحد الاغراض افراد پر صادق آئے ، جیسے مرد ، عورت ۔ منطقیین کے پاس ایک حقیقت اور ماہیت کو نوع کہتے ہیں ، جیسے انسان ۔

(۳) خاصِ جنس : وہ کلی جو مختلف الاغراض افراد پر صادق آئے جیسے ، انسان منطقیین کے پاس جنس وہ کلی ہے جو مختلف ماہیتوں پر صادق آئے جیسے حیوان ۔

حکمِ خاص قرآن کے لفظِ خاص پر عمل کرنا ضروری ہے ۔ خاص میں کسی طرح بیانِ تفسیر کی احتیاج نہیں ۔ وہ خود ظاہر و واضح ہوتا ہے ۔ اگر قرآن کے خاص کی مخالفت خبرِ واحد یا قیاس سے ہوتی ہے اور ان کے جمع کرنے سے خاص کے حکم میں کوئی تغیر نہ آتا ہو تو دونوں پر عمل ہوگا ورنہ خاصِ قران پر عمل ہوگا جو متواتر اور یقینی ہے ۔

مثلاً قرآن میں ہے : فَاقْرَءُ وْامَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰن اور خبرِ واحد میں لَاصَلٰوةَ اِلَّا بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ ہے پس مطلق قراءت فرض ہوگی اور قراءتِ سورہ فاتحہ واجب ہوگی نہ کہ فرض ۔

عام جو ایک سے زیادہ چیزوں کے لئے بوضعِ واحد موضوع ہو اور وہ غیر محصور ہو ، جیسے مُشْرِكُوْنَ يَا مُسْلِمُوْنَ اور مِنْ مَّا (جو شخص ، جو چیز) اور كُلٌّ وغیرہ ۔

عام دو قسم پر ہے : (۱) غیر مخصوص (۲) مخصوص ۔

(۱) عام غیر مخصوص : جس میں سے کوئی شئے خاص نہ کی گئی ہو ۔

حکمِ عام غیر مخصوص : ایسا عام ، خاص کی طرح قطعی ہے ، اس پر عمل لازم ہے ۔ قرآن کے عام کی خبرِ واحد یا قیاس سے تخصیص صحیح نہیں ۔ ہر قسم کے خطاب کے عموم میں حضرت ﷺ بھی داخل ہیں ۔

اگر یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ ، یٰۤاَیُّهَا الرَّسُوْلُ کے ساتھ خطاب کیا گیا ہوتو اس میں اُمّت بھی داخل ہے ۔

اگر پیغمبر کسی اُمّتی کو خطاب کرے تو حنفیہ کے پاس عام نہ ہوگا ، دوسرے ائمہ کے پاس عام ہے ۔ جمع کو جمع کی طرف مضاف کریں تو پہلی جمع کا عدم دوسری جمع کے احاد میں ہر ایک کے مقابل نہیں ہوتا ۔ مثلاً اَمْوَالِهِمْ تو اس کے معنٰی ہر ایک قسم کے مال کے نہیں ہیں ۔ عام کسی مدح یا ذم کا متضمن ہوتا ہے تو حنفیہ کے پاس تمام افراد کو شامل ہوتا ہے جیسے : اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ ۔ اگر شارع کسی حکم کو کسی علّت سے معلل کردے ، مثلاً شراب کی علّت سکر بتائی ہوتو اس کو معیّن کے لئے عمومِ قیاسی سمجھا جائے گا ۔

(۲) عام مخصوص وہ عام جس کے حکم سے بعض افراد علٰحدہ ہوجائیں تو اس خصوص کو عام کا مخصص کہتے ہیں ۔ جیسے فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ کے حکم سے وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِیْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ پس فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِیْنَ عام مخصوص ہے ۔ مخصص کبھی مجمل یا نامعلوم ہوتا ہے ، جیسے اَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ۔ رِبٰوا مجمل ہے ۔ حدیث میں اس کی گو نہ تفصیل ہے ۔

واضح ہو کہ قرآن مجمل ہوتو اس کی تفصیل حدیث سے ، اور حدیث مجمل ہوتو اس کی تفصیل قیاس سے ہوتی ہے ۔

مخصص ، عام میں داخل نہ ہونے کے اعتبار سے مثل استثناء کے ہے اور مستقل و علٰحدہ ہونے کے لحاظ سے مثل ناسخ کے ہے ۔

عامِ مخصوص خواہ معلوم ہو یا نہ ہو ظنی ہے مگر واجب العمل ہے ۔

عامِ بعد تخصیص بھی بقیہ افراد کے لئے حقیقت ہے ۔

قرآن کے عام مخصوص کی تخصیص خبرِ احاد و قیاس سے ہوسکتی ہے ۔

اگر عام کا صیغہ جمع یا اسم جمع کا ہوتو تین فرد باقی رہنے تک تخصیص ہوسکتی ہے جس عام کا صیغہ جمع یا اسمِ جمع کا نہ ہوتو ایک فرد باقی رہنے تک تخصیص ہوسکتی ہے ۔ اگر جمع میں تین افراد نہ رہیں یا اسمِ جنس میں ایک فرد بھی نہ رہے تو یہ نسخ ہوگا نہ کہ تخصیص

مشترک | وہ لفظ جو مختلف وضع سے متعدد معانی کے لئے وضع کیا گیا ہو ۔

عمومِ مجاز جائز ہے اور عمومِ مشترک جائز نہیں ۔

لفظِ مشترک سے وقتِ واحد میں کئی معنٰی نہیں لئے جاسکتے اگر ایک معنٰی معین ہوجائے تو پھر دوسرا معنٰی نہیں لیا جاسکتا ۔

بعض دفعہ لفظِ مشترک کے ایک ایسے مجازی معنٰی لئے جاتے ہیں جو حقیقت پر بھی صادق آتے ہیں اس کو ''عمومِ مجاز'' کہتے ہیں جو جائز ہے کیونکہ اس وقت مجاز ہی مقصود ہوتا ہے ۔

عمومِ مشترک یعنی مشترک سے کئی حقیقی معنٰی مراد نہیں لئے جاسکتے ۔

ماوّل | لفظِ مشترک کے متعدد معانی میں سے ایک معنٰی مجتہد کی غالب رائے سے متعین ہوجائے تو وہ ماوّل ہے ۔

حکم ماوّل : وہ ظنی ہے مگر واجب العمل ہے ۔

ہم حقیقت و مجاز کی تعریف اور احکام سے پہلے دلالت کے اقسام بیان کرتے ہیں ۔

دلالت مطابقی | لفظ کا پورے معنائے موضوع لہ ، پر دلالت کرنا ہے ۔

دلالتِ تضمنی لفظ سے پورے معنائے موضوع لہ، کے ضمن میں جز کا سمجھ میں آنا دلالتِ تضمنی ہے۔

دلالتِ التزامی لفظ سے خارج، مگر لازمِ معنی کا سمجھ میں آنا دلالتِ التزامی ہے۔

حقیقت لفظ کا معنئ موضوع لہ، میں مستعمل ہونا۔

مجاز لفظ کا معنائے غیر موضوع لہ، میں کسی قرینہ اور علاقہ سے مستعمل ہونا۔

علاقہ مجاز، مشابہت ومجاورت ہے جس میں علاقہ مشابہت ہو وہ استعارہ ہے۔ جس میں علاقہ مجاورت ہو وہ مجازِ مرسل ہے

استعارہ میں تین چیزیں ہوتی ہیں: وجہ شبہ، مستعار، مستعارلہ۔

مستعارلہ، یا مشبہّ بہ، جس سے تشبیہ دی جاتی ہے، جیسے اسد (شیر)۔

مستعار یا مشبہّ، جس کو تشبیہ دی جاتی ہے۔ جیسے زید جو شجاع ہے۔

وجہ شبہ، وہ وصف، جو مشبہ ومشبہ بہ میں پایا جاتا ہے، جیسے شجاعت۔

یہ اصطلاح، علمائے بیان کی ہے۔ علماءِ اصول کے پاس استعارہ ومجاز ہم معنٰی ہیں۔

علمائے اصول کے پاس علاقۂ تشبیہ کو اتصالِ معنوی اور مجازِ مرسل کو اتصالِ صوری کہتے ہیں۔

اتصالِ صوری، سبب ومسبب، علت ومعلول، جزء وکل وغیرہ میں ہوتا ہے۔

علت ومعلول میں تلازم رہتا ہے اس لئے علت کہہ کر معلول، اور معلول کہہ کر علت مراد لے سکتے ہیں۔ جیسے شراء و ملک کہ شراء علت ہے اور ملک معلول۔ پس شراء کہہ کر ملک اور ملک کہہ کر شراء مراد لے سکتے ہیں۔

سبب مسبب کا محتاج الیہ ہے۔ مسبب، سبب کا محتاج الیہ نہیں۔ اس لئے سبب کہہ کر مسبب مراد لے سکتے ہیں۔ مسبب کہہ کر سبب مراد نہیں لے سکتے جیسے طلاق و آزادی۔ پس آزادی سے طلاق مراد لے سکتے ہیں۔ طلاق سے آزادی مراد نہیں لے سکتے۔ پس اگر کوئی اپنی زوج سے کہے: میں نے تجھ کو آزاد کیا اور طلاق مراد لی تو ہوسکتا ہے اور لونڈی سے کہے میں نے تجھ کو طلاق دی اور آزادی مراد لی، تو صحیح نہیں۔

حکمِ حقیقت ومجاز: حقیقت کے لئے قرینہ کی ضرورت نہیں۔ مجاز کے لئے قرینہ کی ضرورت ہے۔ ایک لفظ سے ایک استعمال میں معنئ حقیقی ومجازی مراد نہیں ہوسکتے۔

حقیقت کی تین قسمیں ہیں: (۱) متعذر (۲) متروک (۳) مستعمل۔

(۱) متعذر، جس کا سمجھ میں آنا دشوار ہے (۲) متروک، جس کو محاورہ میں ترک کردیا گیا ہو۔

(۳) مستعمل، جو محاورہ میں مستعمل ہو۔

اگر حقیقی معنٰی متعذر یا متروک ہوں تو مجازی معنٰی لئے جائیں گے۔ اگر حقیقت ومجاز دونوں مستعمل ہوں یا حقیقت کثیرالاستعمال ہو تو حقیقت اولیٰ ہے۔ اگر حقیقت مستعمل ہو مگر مجاز، متعارف یعنی کثیر الاستعمال ہو تو امام کے پاس حقیقت اولیٰ ہے، اور صاحبین کے پاس مجازِ متعارف اولیٰ ہے صحتِ مجاز کے لئے معنئ حقیقی کا ممکن ہونا شرط ہے، اگر حقیقت ممکن نہیں تو کلام، لغو ہے۔

قرائنِ مجاز : (۱) عادۃً لغوی معنٰی متروک ہوں۔

(۲) سیاقِ کلام، مرادِ حقیقت سے اباء و انکار کرے۔

(۳) قصد و ارادہ کلام ترکِ حقیقت پر دلالت کرے۔

(۴) محلِ کلام، حقیقی معنٰی سے اباء و انکار کرے۔

صریح و کنایہ صریح: وہ واضح معنی ہے جس پر لفظ بلا قرینہ دلالت کرے۔ حکم صریح کے لئے نیت ضروری نہیں۔

کنایہ: وہ غیر واضح معنے جس کے سمجھنے کے لئے قرینہ کی ضرورت ہو، حقیقتِ متروکہ (مہجورہ) کنایہ میں داخل ہے۔ مجازِ متعارف صریح میں داخل ہے۔

حکمِ کنایہ: کنایہ کے لئے نیت یا دلالتِ حال کی ضرورت ہے۔

متقابلات

ظاہر، نص، مفسّر، محکم ۔ جو کلام ظاہر المراد ہو، وہ قابلِ تاویل ہوگا یا نہ ہوگا۔ اگر نا قابلِ تاویل ہو اور ظہور، محض الفاظ سے ہو تو ظاہر ہے۔

اگر ظہور معنی لفظ کو سیاقِ عبارت سے بھی تائید ہوتی ہو تو نص ہے۔

جو کلام قابلِ تاویل ہو تو وہ یا تو نا قابلِ نسخ ہوگا یا قابلِ نسخ ہوگا۔ اگر قابلِ نسخ ہو تو مفسر ہے۔ اگر نا قابلِ نسخ ہو تو محکم۔

خفی، مشکل، مجمل، متشابہ ۔ جو کلام خفی المراد ہو اور وجہِ خفا نفسِ لفظ نہ ہو بلکہ لفظ کے سوا کوئی عارضی سبب ہو تو خفی اگر خفائے مراد نفسِ لفظ سے ہو تو یا تو قرائن میں غور و تامل سے خفا دور ہوسکتا ہوگا یا نہ ہوگا۔ اگر غور و تامل سے وہ خفا دور ہوسکتا ہو تو مشکل ہے۔ اگر ہمارے تامل سے خفا دور نہ ہوسکتا ہو تو یا تو تفسیر کی اُمید ہوگی یا نہ ہوگی۔ اگر تفسیر کی اُمید ہو تو مجمل ہے اور تفسیر کی اُمید نہ ہو تو متشابہ ہے۔

حکمِ ظاہر ظاہر پر علم و عمل قطعاً واجب ہے۔

ہر حکم کا بلا وجہ وجیہ محتملِ مجاز ہونا صرف احتمالِ عقلی ہے جو غیر معتبر ہے لہذا ظاہر کی قطعیت و وجوب پر نرا احتمالِ مجاز کوئی اثر نہیں ڈال سکتا۔

حکمِ نص نص پر علم و عمل واجب ہے مگر عقلاً عام، محتملِ تخصیص ہے اور حقیقت، محتملِ مجاز مگر چونکہ یہ احتمال بھی دلیل سے ناشی نہیں لہذا نص کی قطعیت پر کوئی اثر نہیں ڈالتا۔

حکمِ مفسر مفسر پر علم و عمل قطعاً واجب ہے۔ مفسر میں احتمالِ عقلی نسخ کا ہے۔

حکمِ محکم محکم واجب الیقین اور واجب العمل ہے: اَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۝

ترجیح بوقتِ تعارض۔ تعارض کی صورت میں ظاہر پر نص کو، نص پر مفسر کو، مفسر پر محکم کو ترجیح ہوگی۔

حکمِ خفی خفی کے معنٰی دریافت کرنے میں تفتیش کرنی چاہئیے کہ یہ خفا اور عدمِ ظہور آیا معنٰی کی زیادتی سے ہے جیسے طرار (کیسہ بر) میں چوری کے معنٰی کی زیادتی ہے، یا معنٰی کی کمی سے، جیسے نباش یعنی کفن چور میں عدم حفاظت کی وجہ سے چوری کے معنٰی کی کمی ہے تو معنٰی کی زیادتی کی صورت میں حکم متعلق ہوگا اور کمی کی صورت میں حکم متعلق نہ ہوگا۔

حکمِ مشکل مرادِ متکلم یعنی مرادِ خدا اور رسول پر اعتقاد رکھنا، پھر سیاق وسباق اور قرائن وغیرہ میں کافی تامل کرنا تاکہ معنٰی ظاہر ہوجائیں۔

حکمِ مجمل اللہ کی مراد پر ایمان رکھے۔ شارع کے کلام سے بیان کو طلب کرے۔ مجمل کا بیان گونہ مفصل ہوتا ہے جیسے لفظ صلوٰۃ کی تفسیر۔ بعض دفعہ مجمل کا بیان بہ ہرگونہ مجمل رہتا ہے اور تفصیل کے لئے تلاش اور غور کی ضرورت ہوتی ہے۔

حکمِ متشابہ اللہ کی مراد پر ایمان رکھے۔ اور اس پر کہ حضرت ﷺ کو متشابہات کے معنٰی معلوم تھے اور ہم کو بھی قیامت کے دن معلوم ہوجائیں گے، قدیم بزرگوں کا یہی طریقہ تھا۔

جب معتزلہ اور مجسمیہ وغیرہ بدعتیوں سے کام پڑا تو متاخرین نے بھی متشابہات کی مناسب تاویل شروع کردی۔

بیان : مبہم، مجمل، مشکل کلام، محتاجِ بیان رہتا ہے۔

بیان، مقصود کے ظاہر کرنے کا نام ہے۔ کبھی بیان اس کلام کو کہتے ہیں جس سے مقصود ظاہر کیا جائے۔

وجوہِ بیان پانچ ہیں: تفسیر۔ تقریر۔ تغییر۔ ضرورت۔ تبدیل۔

بعض لوگ بیانِ تبدیل کو نسخ کہتے ہیں۔ بعض لوگ استثناء کو بیانِ تغییر اور شرط کو بیانِ تبدیل کہتے ہیں اور نسخ کو اقسامِ بیان میں شریک نہیں کرتے۔

قرآن کا بیانِ تفسیر وتقریر، خبرِ واحد سے جائز ہے مگر تغییر، خبرِ واحد سے جائز نہیں کیونکہ خبرِ واحد، قرآن سے قوت میں کم ہے اس لئے خبرِ واحد سے حکمِ قرآن میں تغیر نہیں ہوسکتا۔

وقتِ ضرورت وعمل سے بیان کی تاخیر جائز نہیں۔ ہاں وقتِ خطاب سے بیانِ تقریر وتفسیر کی تاخیر جائز ہے۔

بیانِ تفسیر بعض دفعہ کلام کی مراد بوجہ کلام کے مجمل یا مشترک یا خفی یا مشکل ہونے کے واضح نہیں ہوتی۔ اس کی توضیح کا نام تفسیر ہے۔

بیانِ تقریر بعض دفعہ کلمہ یا کلام کے معنٰی ظاہر ہوتے ہیں مگر ان میں مجاز یا خصوص کا احتمال باقی رہتا ہے۔ پس بیانِ تقریر سے ایسی تاکید کی جاتی ہے کہ احتمال، غیر کا رفع ہوجائے۔

بیانِ تغییر جس سے لفظ کے ظاہر معنٰی میں تغیر آجائے وہ بیانِ تغییر ہے۔

بیانِ تغییر میں مغیر کا متصل اور کلامِ غیر کا مستقل ہونا ضروری ہے۔

بیان تغییر کے کئی اقسام ہیں :-

شرط ۔ استثناء ۔ صفت ۔ غایت ۔ قرینہ ۔ مجاز ۔

استثناء مستثنٰی منہ سے مستثنٰی کی مقدار نکالنے کے بعد جو کچھ باقی رہے اس کو بیان کرنا مقصود ہو ۔

شرط لغت میں موقوف علیہ کو کہتے ہیں ۔

شرط دو طرح پر ہے : (۱) وہ امر خارجی جس پر شئے موقوف ہو مگر اس پر حکم مرتب نہ ہو ۔

(۲) وہ شئے جس پر حکم مرتب ہو ۔

پہلے معنٰے کے لحاظ سے انتفاءِ مشروط ہوتا ہے ۔ دوسرے معنٰی کے لحاظ سے انتفاءِ شرط سے انتفاءِ مشروط ضروری نہیں ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ کسی اور شرط سے مشروط ہو کر پایا جائے ۔

شرط دو قسم پر ہے : (۱) عقلی (۲) شرعی ۔

(۱) شرطِ عقلی : جس کے شرط ہونے کا حکم عقل نے کیا ہو ، جیسے وجودِ عرض کے لئے وجودِ جوہر شرط ہے ۔

(۲) شرطِ شرعی : جس کو شرع نے مشروط کیا ہو ، جیسے نماز کے لئے وضو ۔

شرط بھی مخصصاتِ متصلہ سے ہے جو چیز شرط پر متعلق ہوتی ہے وہ اس وقت تک سببِ حکم نہیں بنتی جب تک شرط نہ پائی جائے پس ۔ معلق بالشرط کا وجود شرط کے وقت سبب بنے گا ، وقت سے پہلے نہ بنے گا ۔ شرط موجود نہ ہونے تک معلق بالشرط اپنے عدمِ اصلی کے سبب سے معدوم رہتا ہے نہ کہ عدمِ شرط کی وجہ سے تعلیق ، ملک یا سببِ ملک سے وابستہ ہوتی ہے ۔

تغییرِ حکم بہ صفت صفت دو طرح کی ہے :

(۱) جو ذات کی قید ہو ۔

(۲) جو اتفاقی ہو ۔ پس صفت سے بھی حکم میں تغییر ہوتی ہے ۔

صفت کے تین درجے ہیں : ادنٰی ۔ اوسط ۔ اعلٰی ۔

ادنی ۔ وہ صفت جو قیدِ اتفاقی ہو اور اس سے غرض متعلق نہ ہو ، جیسے رَبَآئِبُکُمُ الـلَّاتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ میں ''فِیْ حُجُوْرِکُمْ'' قیدِ اتفاقی ہے ۔

اوسط ۔ وہ صفت جو شرط کے معنٰی میں ہو ، جیسے مِنْ فَتَیَاتِکُمُ الْمُؤْمِنَاتِ میں ''مُؤْمِنَات'' بطورِ شرط ہے ۔

اعلی ۔ وہ صفت جو علت کے معنٰی میں ہو ، جیسے السَّارِقُ وَالسَّارِقَـةُ اہلِ اصول کے پاس علت کے انتفاء سے معلول کا انتفاء ضروری نہیں کیونکہ ممکن ہے کہ معلول دوسری علت کے ساتھ پائے جائے ۔ اعلٰی کا جب یہ حال ہے تو دوسری صفات کے انتفاء سے معلول کا انتفاء کیونکر لازم آئے گا ۔

تغییر بغایت | غایت دو طرح پر ہے۔

(۱) یہ کہ فعل کے کسی چیز یا کسی جگہ پر منتہی ہونے پر دلالت کرے اور وہ چیز یا مکان اس حصہ سے باہر ہو۔

(۲) یہ کہ وہ چیز یا مکان اس حصہ سے باہر نہ ہو۔

اگر غایت (یعنی انتہائی حد) مغیا سے (یعنی اس چیز سے جس کی انتہا ہوتی ہے) علٰحدہ بذاتِ خود قائم ہو اور معنٰی کے وجود کی محتاج نہ ہو، تو معنٰی میں داخل نہ ہوگی۔ مثلاً گھر اس دیوار سے اس دیوار تک ہے تو دونوں دیواریں خارج ہوں گی۔

اگر غایت بنفسہ قایم نہ ہو تو اس کی دو صورتیں ہیں:

(۱) اگر غایت کو صدرِ کلام یعنی ابتدائی حصّہ کلام شامل ہوگا تو وہ غایت، مغیا کے حکم میں داخل ہوگی اور اس کا حکم اپنے ماسوا کے اخراج کے لئے ہوگا جیسے اِلَی الْمَرَافِقِ تو ہاتھ دھونے میں کہنیاں داخل ہوں گی۔

(۲) اگر صدرِ کلام میں غایت شامل نہ ہو یا اس کے شامل ہونے میں شبہ ہو تو مُـغَیَّـا میں غایت داخل نہ ہوگی۔ اور حکم اس حد تک ممتد ہو کر رہ جائے گا: ''اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی اللَّیْلِ'' تو رات روزہ میں داخل نہ ہوگی۔

بیانِ ضرورت | گو بیانِ ضرورت کے لئے کوئی دلالت کرنے والا لفظ نہیں ہے مگر مقتضائے کلام کی ضرورت سے وہ بیان حاصل ہوتا ہے۔ بیانِ ضرورت کی چار قسمیں ہیں جن میں سکوت، خود مراد پر دلالت کرتا ہے۔

(۱) بیان ایسا واضح ہو کہ مثل کلام کے ہو، مثلاً کیا زید آیا؟ کے جواب میں صرف ''آیا''۔

(۲) متکلم کا حال، بیانِ مراد پر دلالت کرے مثلاً باکرہ کا سکوت اطلاعِ نکاح پر حکم میں اذن کے ہے۔

(۳) دھوکہ کے دفع کے لئے مثلاً شفیع کا سکوت اطلاعِ بیع پر حکم میں اذن کے ہے۔

(۴) دفعِ طولِ کلام کے لئے مثلاً پانچ سو دو روپئے بہ عوض پانچ سو روپئے اور دو روپیہ کے ہوں گے۔

بیانِ تبدیل یا نسخ | اگر ایک زمانہ میں اقتضائے مصلحت سے ایک حکم دیا گیا ہو اور دوسرے زمانے میں مصلحت بدل جانے کی وجہ سے دوسرا حکم دیا گیا ہو تو پہلا حکم منسوخ اور دوسرا ناسخ ہے۔ منسوخیت کا محل ممکن ہے کہ عقل ہو، پس جو حکم عقلی یا واجب لذاتہ ہو جیسے ایمان یا ممتنع لذاتہ ہو جیسے کفر، وہ منسوخ نہیں ہوتا جو تابید اور دوام پر دلالت کرے جیسے نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ۔

اب کوئی حکم منسوخ نہیں ہوسکتا کیونکہ رسولِ اکرم ﷺ کا انتقال ہو چکا ہے جو ناسخ کے بیان کرنے والے تھے۔

دوام، صریح لفظ سے ثابت ہوتا ہے یا دلالت سے۔

اگر ایک خاص وقت کے لئے ایک حکم دیا گیا تھا اور وقت کے گزر جانے کے بعد وہ حکم اُٹھ گیا تو اس کو نسخ نہیں کہتے۔ عمل سے پہلے بھی حکم کا نسخ ہوسکتا ہے۔ ضعیف، قوی کا ناسخ نہیں ہوسکتا لہذا قیاس، اجماع کا، اجماع، خبرِ احاد کا اور وہ خبرِ متواتر کا یا قرآن کا ناسخ نہیں ہوسکتا۔

اکثر کا قول ہے کہ قرآن کا نسخ، خبرِ متواتر سے جائز ہے۔

نص کا کوئی وصف جاتا رہنا بھی نسخ ہی کی ایک قسم ہے۔ مثلاً کسی نص کے عموم یا اطلاق کا جاتا رہنا بھی نسخ ہی ہے۔

احادیثِ مشہورہ سے قرآنِ مجید پر زیادتی جائز ہے۔ خبرِ متواتر و مشہور کے سوائے دوسرے سے زیادتی جائز نہیں، نہ خبرِ واحد سے نہ قیاس سے۔

نسخِ حکم بغیر بدل کے بھی جائز ہے۔

ایک حکم کا نسخ دوسرے ایسے حکم سے جو اوّل سے کمتر یا برابر بلکہ سخت تر ہو تو بھی جائز ہے۔

حملِ مطلق و مقید | نصِ مطلق و مقید کے وارد ہونے کی پانچ صورتیں ہیں:

۱۔ غیرِ حکم میں وارد ہوں، مثلاً اسباب و شروط میں تو مطلق کا حمل مقید پر نہ ہوگا۔

۲۔ ایک ہی حکم ایک ہی حادثہ میں وارد ہو تو مطلق کو مقید پر حمل کیا جاتا ہے۔

۳۔ مطلق و مقید ایک ہی حکم میں وارد ہوں اور حادثے دو ہوں، تو حنفیہ کے پاس مطلق کا حمل مقید پر نہ کیا جائے گا۔

۴۔ ”حادثہ ایک ہو اور حکم دو ہوں! تو حنفیہ کے پاس مطلق کا حمل مقید پر نہ ہوگا۔

۵۔ دو حکم دو حادثوں میں وارد ہوں تو مطلق کا حمل باتفاق مقید پر نہ ہوگا۔

مفہوم | امام شافعیؒ کے پاس مدلولِ مطابقی و تضمنی کو منطوق اور مدلولِ التزامی کو مفہوم کہتے ہیں۔

مفہوم کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ **مفہوم موافق**: مسکوت عنہ نفی و اثبات میں منطوق کے حکم میں ہو۔

۲۔ **مفہومِ مخالف**: مسکوت عنہ اس حکم میں منطوق کے مخالف ہو۔

مفہومِ مخالف کی شرط یہ ہے کہ:

(۱) منطوق کا ذکر بطریقِ عادت کے نہ ہو۔

(۲) مفہوم مخالف منطوق سے اولیٰ یا اس کے مساوی نہ ہو۔

(۳) منطوق کسی سوال کے جواب میں نہ ہو۔

(۴) کسی حادثہ کی بناء پر نہ ہو۔

(۵) نہ اس لئے ہو کہ سامعِ ناواقف، اس حکم سے واقف ہو جائے۔

مفہومِ مخالف کے اقسام | (۱) مفہومِ لقب (۲) مفہومِ عدد (۳) مفہومِ وصف (۴) مفہومِ شرط۔

حنفیہ کے پاس کسی شئے کے بیان سے دوسرے کی نفی نہیں نکلتی۔ سب سے قوی تر چیز شرط و علت ہے مگر ہوسکتا ہے کہ

ایک علت وشرط نہ پائی جائے تو معلول ومشروط دوسری علت یا شرط کے ساتھ پایا جائے ۔

متعلقاتِ نصوص | جس سے الفاظ کے معنٰی پر دلالت کرنے کی کیفیت معلوم ہوتی ہے ۔ متعلقاتِ نصوص چار ہیں :

(۱) عبارۃ النص (۲) اشارۃ النص (۳) دلالتہ النص (۴) اقتضاء النص ۔

عبارۃ النص وہ حکم جو معنیِ لفظ وسیاق ومقصودِ کلام سے ثابت ہو ۔

اشارۃ النص وہ حکم جو الفاظِ کلام سے بغیر زیادت کے ثابت ہو مگر سیاق اس کے لئے نہ ہو چونکہ اشارہ میں سیاق مدد نہیں دیتا لہذا بہ نسبت عبارت کے اشارہ میں خفاء مراد ہے ، عبارت و اشارہ دونوں لفظ سے ثابت ہوتے ہیں لہذا ان میں عموم بھی ہوتا ہے خصوص بھی ۔ عبارت و اشارہ میں تعارض ہو تو عبارت کو اشارہ پر ترجیح ہے ۔

دلالۃ النص الفاظ سے ایک حکم نکلتا ہے ۔ اس کی علّت ایسی واضح ہوتی ہے کہ ہر زبان داں اس کو سمجھتا ہے ۔ کسی قیاسِ فقہی و اجتہاد کی ضرورت نہیں ۔ نیز قیاسِ فقہی ظنی ہے اور دلالتہ النص قطعی ہے ۔ اس سے حدود و کفارات تک ثابت ہوتے ہیں دلالتہ النص کی مثال وَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ تافیف یعنی اُف کہنے کی علّت ایذا رسانی ہے ۔

دلالت بغیر واسطہ کے ثابت ہوتی ہے اور اشارہ بواسطہ علت کے ، دلالت غیر مقصود ہوتی ہے اور اشارہ مقصود ۔

دلالت و اشارۃ النص میں تعارض ہو تو بعض کہتے ہیں کہ قوی تر کو ترجیح ہے اور بعض کے پاس علی العموم اشارہ کو ترجیح ہے

اقتضاء النص وہ تقدیر ہے جو نص کی تصحیح کے لئے کی جاتی ہے کیونکہ بغیر مقتضاءِ نص کے معنٰی متحقق نہیں ہو سکتے ۔

اشارۃ النص بھی قطعی ہے ۔ وقتِ تعارض اشارہ کو اقتضاء پر ترجیح ہے ۔ اقتضاء النص کو عموم نہیں کیونکہ وہ لفظ نہیں اقتضاء النص ، بقدر ضرورت مانا جائے گا ۔

تاویلِ وجودی | اکثر لوگ باہم اختلاف کرتے ہیں ، ایک شخص ایک قسم کا وجود مانتا ہے اور دوسرا دوسری قسم کا ۔ کسی قسم کا وجود نہ ماننا تو تصریحِ انکار ہے ۔ اعلیٰ قسم کا وجود جب تک محال ثابت نہ ہو ، ادنیٰ قسم کا وجود مان لینا ، انکار نہیں ہے ، مگر ایک قسم کا جہل و تعدی ضرور ہے ۔

امام محمد غزالیؒ نے اعلیٰ وجود کے محال نہ ہونے کے وقت ادنیٰ درجے کے وجود کے قائل کی تکفیر کی ہے ۔

وجود کی کئی قسمیں ہیں :

(۱) وجودِ خارجی یا عینی یا شہادی یا ذاتی

(۲) وجودِ خیالی یا حسی

(۳) وجودِ عقلی

(۴) وجودِ شبہی

(۵) وجودِ مجازی

وجودِ مجازی کی دو قسمیں ہیں :

(۱) مجازِ عقلی

(۲) مجازِ لغوی

وجودِ خارجی | ہمارے ذہن ، حس اور عقل سے خارج ذاتِ شے کا وجود مثلاً زید ہے ، یعنی خارج میں اپنی ذات سے ہے ۔ ہم نے ذاتِ زید کو دیکھ کر اس کو موجود فی الخارج ادراک کیا ہے ۔

وجودِ خارجی یا ذاتی بھی دو قسم کا ہے :

(۱) ایک لذاتہ یعنی دوسرے سے مستفاد نہیں بلکہ خود بخود بے واسطہ ہے مثلاً خدائے تعالیٰ موجود ہے ۔

(۲) دوم بواسطہ : ممکنات و مخلوقات کا وجود لذاتہ نہیں ہے بلکہ قدرت و خلق و امرِ الٰہی سے موجود ہے مثلاً زید ہے یعنی خدا کے پیدا کرنے سے یا مثلاً نورِ شمس ہے یعنی لذاتہ اور قسم منور ہے یعنی مستفاد نورِ شمس سے ہے ۔ وہ جو للذات و بالذات ذاتِ حق میں منحصر ہے ۔

وجودِ خیالی یا حسی | یعنی ہم خارج میں زید کو دیکھ کر اس کے فوٹو اور صورت کو اپنے حاسہ میں لاتے ہیں ۔

بات یہ ہے کہ حواسِ خمسہ ظاہری سے تمام صورتیں حسِ مشترک میں جو ایک خاص قوت ہے ، جمع ہوجاتی ہیں اور ہم کو نظر آتی اور محسوس ہوتی ہیں ۔ بہر حال جب حسِ مشترک سے التفات ہٹ جاتا ہے تو یہ صورتیں اس کے خزانہ میں جس کو خیال کہتے ہیں ، مخزون و جمع ہوجاتی ہیں ۔ پھر جب دوبارہ التفات کرتے ہیں تو پھر حسِ مشترک میں واپس آ کر پھر نظر آتی ہیں مثلاً ہم نے زید کا ایک زمانے کے بعد خیال کیا اور اس کی صورت ، خیال سے حسِ مشترک میں آ کر نظر آ گئی ۔

خیال دو قسم کا ہے : (۱) خیالِ متصل ، ہمارا اپنا خیال

(۲) خیال منفصل ، عالم کا خیال جس کو عالمِ مثال کہتے ہیں ۔

یہ ہمارا خیال ، ہمارے تحتِ قدرت ہے جب چاہیں دیکھ لیں اور عالمِ مثال ہمارے تحتِ قدرت نہیں ، خواب میں خیالی صورتیں نظر آتی ہیں ۔ اگر یہ خیالی صورتیں خود ہم سے پیدا ہوتی ہیں تو یہ خواب اضغاثِ احلام یعنی واہی تباہی خواب ہے ، اگر عالم مثال سے صورتیں نظر آئیں تو ’’ رؤیاءِ صَادقه ‘‘ ہے ۔

بعض دفعہ خود ہمارا تخیل ، قوی ہوکر نہ صرف ہم کو بلکہ دوسروں کو بھی نظر آتا ہے ۔ ہمارے شخصی خیال سے عالمِ مثال کو ایک ربط ہے ۔ ہمارا شخصی خیال ایک نقطہ پر جم جاتا ہے تو عالمِ مثال جلد منکشف ہوجاتا ہے ۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے ہمارا مضمون ’’ عالمِ مثال ‘‘ رسالہ ’’ حکمت اسلامیہ ‘‘ میں ملاحظہ ہو ۔

وجودِ عقلی صور و خیال و خصوصیات سے مجرد ہوکر ایک کلی و مطلق و مجرد معنٰی کا وجود، وجودِ عقلی یا وجودِ مجرد کہلاتا ہے مثلاً غضب ایک قوت ہے کہ دفعِ اعداء اور ان پر غلبہ حاصل کرتی ہے۔ ہمارے غضب میں اس قوت کے اظہار کے وقت خونِ دل بہ غرضِ انتقام جوش کرتا ہے اور چہرہ سرخ ہوجاتا ہے۔ غضبِ کلی میں جوشِ خونِ دل کو دخل نہیں۔ پس غضب اللہ میں جوشِ خونِ دل نہیں ہے، بلکہ اس کی حقیقت ہے جو لوازم جسمِ بشری سے پاک ہے اور جس کے لئے وجودِ خیالی نہیں بلکہ وجودِ عقلی ہے۔

وجودِ شبہی ایک شئے سے اس کا شبیہ مراد لینا یا یوں سمجھو کہ ایک شئے کا اس کے شبیہ و مشابہ کی صورت میں نظر آنا، مثلاً حضرت ﷺ نے علم کو دودھ کی صورت میں دیکھا یا مثلاً قہر کو کسی نے آگ کی صورت میں دیکھا، یا غضب کو شیر کی صورت میں یا طاعون کو ہاتھی کی صورت میں، یا اسماء وصفاتِ الٰہی کو بعض بعض تشبیہی صورتوں میں۔ پس قہرِ خدا کا وجودِ شبہی آگ ہے۔ وجودِ شبہی میں سے اس کی حقیقت کی طرف راہ نکال لینا، تشبیہی خواب یا کشف کی تعبیر دینا لیاقت کا کام ہے۔ اگر کسی نے یہ کہا کہ قہرِ الٰہی قیامت میں آگ کا تمثل لیتا ہے تو بالکل صحیح ہے یا کسی نے قہرِ الٰہی کو آگ کہا یا آگ کی حقیقت، قہرِ الٰہی بتائی تو بھی بالکل درست ہے، یا کسی نے حجرِ اسود کے یمین اللہ ہونے کے یہ معنٰی بتائے کہ جس طرح ہاتھ بغرضِ تعظیم چوما جاتا ہے اسی طرح بغرضِ تعظیمِ شعائر اللہ حجرِ اسود چوما جاتا ہے، اس لئے حجرِ اسود کو یمین اللہ کہنا درست ہے۔ غرض کہ وجودِ شبہی میں ایک قسم کا استعارہ ہوتا ہے جو لوگ واقف ہیں خوب سمجھتے ہیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے، اور جو کچھ ہورہا ہے، وہ سب عینِ ثابت کی تشبیہات و تمثیلات ہی ہیں۔

وجودِ مجازی کسی علاقہ کی وجہ سے ایک شئے سے اس کا متعلق مراد لیا جائے مثلاً کسی نے کہا کہ ایسی زور کی بارش ہوئی کہ پرنالے بہ رہے تھے، تو پرنالے کی طرف بہنے کی نسبت اس کے مجاور (یعنی قریب کی چیز پانی) کی وجہ سے ہے۔ پس اس نسبتِ مجازی کی وجہ سے ہم پرنالے کے بہنے کے منکر نہیں۔ دیکھو" یَاهَامَانُ ابْنِ لِیْ صَرْحًا " میں بناء کی نسبت ہامان کی طرف کی گئی ہے کیونکہ وہ حکم دینے والا تھا" وَلَمَّا یَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِیْنَ جَاهَدُوْا مِنْكُمْ " میں عدمِ علم کی نسبت اللہ کی طرف ہے حالانکہ وہ حضرت ﷺ کی صفت ہے اس علاقہ سے کہ حضرت ﷺ خلیفۃ اللہ اور رسول ہیں۔ میں ان تمام مباحث کو یہاں اس مختصر مقدمہ میں بہ تفصیل نہیں بیان کرسکتا۔ بالجملہ اعلیٰ درجہ کا وجود جب تک ممکن ہو ادنیٰ قسم کا وجود نہ لینا چاہئیے۔ اپنے جہل و ناواقفیت کی وجہ سے جس طرح انکار درست نہیں اسی طرح تاویلِ بعید بھی بعید عن الحق ہے۔

واضح ہو کہ قرآن شریف کا امر، وجوب اور فرضیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے خلاف، اباحت کے لئے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے جیسے" اِذَا حَلَلْتُمْ فَاصْطَادُوْا " یعنی جب احرام کھول دو، شکار کرسکتے ہو، اور اب شکار کرنے کی ممانعت باقی نہیں اسی طرح نہی یعنی امتناعی حکم کے لئے حرمت ہے، کراہت کے لئے قرینہ کی ضرورت ہے۔

مسئلۂ عدمِ نسخِ قرآن

اب مسئلۂ عدمِ نسخِ قرآن کے متعلق کچھ توضیحات دیئے جاتے ہیں: نَسَخَ الشَّیءَ یَنْسَخُهٗ نَسْخًا : اَزَالَهٗ اس نے شئے کو زائل کردیا۔ یُقَالُ نَسَخَتِ الشمسُ الظِّلَّ وَالشَّیْبُ الشَّبَابَ اَیْ اَزَالَهٗ : دھوپ نے سائے کو، بڑھاپے نے جوانی کو زائل کردیا: وَنَسَخَتِ الرِّیْحُ اٰثَارَ الدَّارِ وَغَیَّرَتْهَا : ہوا نے گھر کے آثار کو کھنڈر و متغیر کردیا۔ وَفُلَانٌ الشَّیْءَ اَبْطَلَهٗ ؛اور فلاں نے اس شئے کو باطل کردیا: وَاَقَامَ شَیْئًا اٰخَرَ مَقَامَهٗ اور ایک دوسری شئے کو اس جگہ قائم کردیا۔

قرآن شریف کی آیتوں اور احکام کے منسوخ ہونے میں اختلاف ہے۔ قرآن شریف کے تمام ادیان وملل اور جاہل اقوام کے رسوم و عادات و احکام کے ناسخ ہونے میں، ان میں تغیر پیدا کرنے میں نہ ہم کو نہ کسی اور کو کوئی اختلاف ہے۔ ان مفسرین کے اختلافات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کے پاس آیاتِ احکام میں سے آدھے ناسخ ومنسوخ ہیں، چنانچہ اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ابن العربی نے اس تعداد کو گھٹایا۔ حضرت امام جلال الدین سیوطیؒ نے منسوخ آیتوں کی تعداد ۲۱ تک مانی۔ حضرت شیخ احمد بن عبدالرحیم شاہ ولی اللہؒ نے صرف (۴۔۵) تک مانی۔

میرے خیال میں قرآن کا کوئی حکم، کوئی آیت منسوخ نہیں۔ شاہ صاحب نے ان (۲۱) آیتوں کے نسخ کے جو جوابات دیئے ہیں ان کی تفصیلی شرح میں نے ایک مستقل رسالہ میں کی ہے۔ اس موقع پر صرف غلط فہمی کے اسباب، مجمل طور پر بیان کروں گا اور ان پانچ آیتوں کو بھی نسخ کے جھگڑے سے نکال لوں گا جن کو شاہ صاحب بھی منسوخ ماننے پر مجبور ہوئے تھے۔ اس طرح ان کے علمی خاندان کا ایک شخص ان کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دے گا۔ وَلِلّٰهِ الْحَمْدُ۔

قدیم زمانے میں نسخ کے معنٰی تغیر کے لئے جاتے تھے۔ پچھلی آیت کے حکم میں کچھ تغیر دیکھتے تو کہہ دیتے، یہ آیت اس آیت کی ناسخ ہے۔ اصولِ فقہ میں پہلی آیت کے حکم کو باطل کرنا اور اس کے عوض دوسرا حکم قائم کرنا نسخ ہے۔ اور اس وقت عامتہ الناس نسخ کے یہی معنٰی لیتے ہیں۔ اس کے بعد واضح ہو کہ مفسرین کے اس قدر کثیر التعداد آیتوں کے منسوخ ماننے کے کیا اسباب ہوئے؟

۱۔ قرآن شریف سے زمانہ جاہلیت کے رسوم و عادات یا سابقہ مذاہب کے حکم موقوف کردیئے گئے ہوں، یا ان میں تغیر کیا گیا ہو، تو سابقین کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت ناسخ ہے، مگر غور کیجئے کہ یہ آیت کیا کسی آیت وحکم قرآنی کی بھی ناسخ ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے زیر بحث تو آیات و احکامِ قرآنی کی منسوخیت ہے نہ کہ سابقہ رسوم و عادات اور احکام کا منسوخ ہونا۔

۲۔ بعض وقت ایک عام حکم دیا جاتا ہے اور خاص حالات پر خاص حکم دیا جاتا ہے۔ اگر عام حکم کے ساتھ ہی وہ خاص حکم ہو تو اس کو استثناء کہتے ہیں، اور اگر کسی دوسرے موقع پر خاص حکم دیا جائے تو اس کو تخصیص کہتے ہیں۔ استثناء اور تخصیص کو عام حکم کا ناسخ کہنا درست نہیں، تعزیراتِ ہند و دکن کے شروح میں مستثنیاتِ عامہ بیان کئے گئے ہیں، تو کیا اس سے تمام تعزیرات کا یک قلم منسوخ شدہ ہونا ماننا پڑے گا؟ ہرگز نہیں۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا، کیا اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا سے اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ کا حکم منسوخ ہوگیا؟ ہرگز نہیں۔

۳۔ قوانین، مختص المقام بھی ہوتے ہیں اور مختص الوقت بھی۔ وقت گزرنے کے بعد وہ وقتی حکم باقی نہیں رہتا کیونکہ اتنے ہی وقت کے لئے وہ حکم دیا گیا تھا، نہ کہ وہ حکم منسوخ ہوگیا۔ مثلاً چار روز کے لئے کرفیو آرڈر جاری ہوا تھا، مدت گزرنے کے بعد وہ حکم باقی نہیں رہا۔ اس صورت میں یہ کہنا کہ وہ حکم منسوخ ہوگیا، درست نہیں بلکہ ختمِ مدت کی وجہ سے وہ حکم باقی نہیں رہا۔ اب میں عدمِ نسخ پر ایک اہم آیت پیش کرتا ہوں جو اس مسئلہ پر نہایت روشنی ڈالے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِنْ كِتَابٍ وَّ حِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِىْ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا۔

اور یاد کرو جب ہم نے تمام پیغمبروں سے عہد لیا تھا۔ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے۔ پھر تمہارے پاس ایک رسول آئے، تمہارے پاس جو کتاب ہے اس کی تصدیق کرتا ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ اور اس کی نصرت و مدد کرو، پھر ارشادِ الٰہی ہوا، کیا تم نے اس کا اقرار کرلیا اور اس کا ذمہ لے لیا؟ سب نے عرض کیا، بے شک ہم نے اقرار کرلیا۔

ذرا اس آیت پر غور فرمایئے، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء کے ادیان وقتی تھے، جب خاتم النبیینؐ مبعوث ہوئے تو ان کا وقت ختم ہوگیا۔ اس تحقیق پر تمام انبیاء کے ادیان بھی منسوخ نہیں ہوتے بلکہ ان کا وقت نہ رہا اس لئے وہ احکام بھی باقی نہیں رہے۔

۴۔ بعض دفعہ ایک دائمی حکم دینا مقصود ہوتا ہے مگر عمل یا اجتناب میں آہستہ آہستہ سختی بڑھائی جاتی ہے، یہاں تک کہ حکمِ مقصود پر عمل کرنے کی لوگوں میں قابلیت پیدا ہوجائے، یہ کمالِ حسنِ تعلیم و تربیت ہے، ہمارے خیال میں ان ابتدائی مراحل کو منسوخ نہ کہنا چاہئیے۔ بلکہ اصل حکم کا توطیہ و تمہید سمجھنا چاہئیے۔ اصل مقصود وہ حکم سمجھا جائے گا جو ہمیشہ کے لئے دیا جائے گا۔ مثلاً شراب دفعتاً حرام نہیں کی گئی۔ پہلے کہا گیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى: یعنی شراب پئے ہوئے نماز کے قریب نہ جاؤ، پھر کئی مرحلوں کے بعد شراب حرام کی گئی۔ پس لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوة کا حکم منسوخ نہیں ہوا بلکہ وہ حرمتِ شراب کا مقدمہ اور تمہید تھا۔ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ روسی لوگ بُت پرست تھے، ان کا وفد، تحقیقِ مذہب کے لئے جب قسطنطنیہ پہنچا تو مذہبِ اسلام ان کو پسند آیا۔ نواہی میں شراب پینا بھی تھا۔ روسی وفد نے کہا: ہم سرد ملک کے رہنے والے ہیں بغیر شراب کے آرام سے نہیں رہ سکتے۔ علماء نے ترکِ شراب پر شد و مد سے تاکید کی، جس کا نتیجہ روسیوں کا نصرانی ہوجانا تھا۔ اگر کفر کے مقابل نشہ سے خاموش ہوجاتے، بڑے شر کے مقابل چھوٹے شر کو اختیار کرلیتے تو اتنی بڑی قوم اسلام کے ہاتھ سے نہ نکل جاتی اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایک ہی دفعہ میں شراب کو حرام کردیتا مگر نہیں، اس نے بمراحل رفتہ رفتہ اس کو حرام فرمایا۔

علماء اسلام کو بھی چاہئیے کہ نومسلموں کو پہلے توحید کی، پھر دوسرے اہم ارکان کی تعلیم دیں۔ پھر رفتہ رفتہ ایک ایک حکم کا پابند بنائیں۔ ابھی غریب مسلمان ہوا، اس کی ختنہ بھی کروا ڈالی۔ فرض نمازوں کے ساتھ سنتوں کی بھی تاکید کی۔ روزوں کے ساتھ تراویح بھی لگادی۔ ان سب باتوں کی پابندی آہستہ آہستہ کروائی جائے۔ فرض کے برابر سنن و نوافل کو اہمیت نہ دی جائے۔ غریب نومسلم پر للہ رحم کریں۔

۵ ۔ پیغمبر کا حکم فرض بھی ہوتا ہے اور مباح کی بھی اجازت دی جاتی ہے ۔ پہلے ایک حکم ، فرض ہی کیوں سمجھا جائے کہ بعد میں اس کی منسوخیت کو ماننا پڑے ۔ یا یوں سمجھو کہ بعض احکام قانونی ہوتے ہیں اور بعض احکام اخلاقی ۔ اخلاقی حکم کو قانونی مانا ہی کیوں جائے کہ اس کی منسوخیت لازم آئے ۔ اخلاقی حکم کی خلاف ورزی پر قانون گرفت نہیں کرتا ۔

۶ ۔ بعض وقت ایک جملہ کے دو معنٰے ہوتے ہیں ۔ متکلم کا ایک مقصد رہتا ہے اور لوگ اس کے ایک جدا معنٰی سمجھتے ہیں ۔ متکلم دوبارہ صاف الفاظ میں اپنے مقصد کو ظاہر کرتا ہے ، لوگ سمجھتے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا ۔ حالانکہ پہلا اور دوسرا حکم دونوں ایک ہیں ، لوگوں کے سمجھنے میں غلطی ہوتی ہے ۔

۷ ۔ بعض دفعہ ایک خاص واقعہ کے متعلق حکم دیا جاتا ہے اور قید اتفاقی رہتی ہے ، ایک دوسرے جملہ میں وہ قید اتفاقی نہیں رہتی ، بلکہ عام حکم رہتا ہے جو مقصود و مدارِ حکم ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ مقید حکم منسوخ ہوگیا ۔

۸ ۔ بعض دفعہ ایک خاص امر کے متعلق حکم دیا جاتا ہے اور لوگ اس امر پر دوسرے امور کو قیاس کر کے اس حکم کو متعدی کرتے ہیں حالانکہ امرِ اول میں خصوصیات ہوتے ہیں جن کی بناء پر حکم دیا گیا ہے اور وہ حکم دوسروں کے لئے متعدی نہیں ہوسکتا ، لہذا امرِ اول میں جو قیاسات کئے جارہے ہیں ان کے خلاف حکم دیا جاتا ہے ۔ اس طرح ان کے قیاسات غلط اور قیاس مع الفارق ثابت کئے جاتے ہیں ، اور لوگ سمجھتے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا ۔

۹ ۔ لوگ سمجھتے ہیں کہ مدنی آیتوں سے جو غلبۂ اسلام کے زمانہ میں اتریں ، مکّی آیتیں منسوخ کردی گئیں ، ذرا کوئی غور کرے رسول اللہ ﷺ خاتم النبیین ہیں ، ان کا دین ایک مخصوص زمانہ کے لئے نہیں ہے ، قیامت تک رہنے والا ہے ۔ کیا مسلمان ہمیشہ غلبہ میں رہے ، یا غلبہ میں ہیں ؟ کیا تمام ممالک کے مسلمانوں کی ایک ہی حالت ہے ، ہرگز نہیں ، ہرگز نہیں ، ترکوں اور افغانوں کی مدنی حالت ہے ۔ عراق و شام و فلسطین والوں کی اور ، اب تو ایران کی بھی مکّی حالت ہے ۔ ہر ایک کے لئے اس کے مناسب آیت و حکمِ قرآن ہے ۔ حالت بدل گئی تو حکم بھی بدل گیا لہذا مکّی آیتیں بھی منسوخ نہیں بلکہ مدینہ والوں کے مناسب حال نہیں ، کیا مدینہ میں جب آیتِ سیف اتری تو مکّہ والوں نے اس پر عمل کیا ؟ کیا اس آیت پر عمل نہ کرنے سے وہ سب عاصی تھے ؟ ہرگز نہیں ، زمانہ گردش میں رہتا ہے ۔ بعض مدنی آیتوں پر عمل کرنا ، اصولی آیات وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَۃِ اور لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا کے خلاف ہوتا ہے ۔ پس مکّی آیتیں اپنے مقام پر بحال ہیں اور مدنی اپنے مقام پر ۔

اب میں پہلے ان دو اہم آیتوں کے متعلق بحث کرنا چاہتا ہوں جن سے مسئلہ ناسخ و منسوخ کے سمجھنے میں فائدہ ہوگا ۔

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی : مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰیَۃٍ اَوْنُنْسِھَانَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْھَآ اَوْمِثْلِھَا ؛ لفظ اٰیَۃٌ کے معنٰی ہیں نشانی یا علامت اور کلام اللہ کا ایک فقرہ بھی ہے ، لوگ اس آیتِ شریف کے معنٰی لیتے ہیں ہم کسی آیتِ قرآنی کو منسوخ نہیں کرتے یا بھلا نہیں دیتے مگر اس سے بہتر آیتِ قرآنی یا اس کی مثل آیت لاتے ہیں ۔

محلِ غور یہ ہے کہ قرآن تو بوعدۂ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَ اِنَّا لَہٗ لَحٰفِظُوْنَ محفوظ ہے ۔ ابتداء سے اب تک لاکھوں حافظ چلے آرہے ہیں ، پھر کب اور کونسی آیت بھلائی گئی ؟ قرآن شریف کی ایک آیت سے بہتر دوسری آیت لانے کے معنٰی

سمجھنا بھی بالکل نامناسب ہے لہذا اس کے صحیح معنٰی ہمارے خیال میں یہ ہیں ۔ ہم اپنے آثارِ قدرت ، اپنی نشانیاں اگر دور کرتے یا متغیر کرتے ہیں ، یا امتدادِ زمانہ کی وجہ سے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر دوسری نشانیاں لاتے ہیں دیکھو آثارِ قدرت کے تازہ بہ تازہ جلووں کا سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس ترجمہ پر کوئی غبار نہیں ۔ یہ آیت مسئلہ ناسخ ومنسوخ کی اصل ہے ، جان ہے ۔قرآن شریف کو دیکھیئے اٰیَۃٌ بہ معنی آثارِ قدرت اور نشانی سے بھرا پڑا ہے : لِنُرِیَہٗ مِنْ اٰیَاتِنَا ۔ سَنُرِیْھِمْ اٰیَاتِنَا ۔ فَاْتِ بِاٰیَۃٍ ۔ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ۔ وَفِی الْاَرْضِ اٰیَاتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ۔ ابنِ حزم ظاہری ثبوتِ نسخ میں فرماتے ہیں کہ حضرت علیؓ کا گذر ایک قاضی کے پاس سے ہوا ۔ آپ نے قاضی سے سوال فرمایا کیا تم ناسخ کو منسوخ سے ممتاز کرتے اور سمجھتے ہو؟ قاضی نے کہا : جی نہیں ۔ حضرت علیؓ نے فرمایا ۔ تم خود بھی ہلاک ہوئے ، اور دوسروں کو بھی تم نے ہلاک کیا ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ قدیم محاورے میں نسخ کے معنٰی تغیر کے تھے جیسا کہ بیان کیا گیا ۔ پس حضرت علیؓ کے ارشاد کے معنٰی یہ ہیں کہ کیا تم ان آیات کو جانتے ہو جس سے کسی عام آیت کی تخصیص ہوتی ہو یا اس سے چند لوگ مستثنٰی ہوں ۔

آیتِ دوم ’’ کافرون ‘‘ کی سورت میں ہے : لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ○

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۔ قُلْ یٰٓاَیُّھَا الْکٰفِرُوْنَ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۔ لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ ۔ اس کے یہ معنٰی لئے جاتے ہیں کہ تم کو تمہارا مذہب مبارک ہو ، ہم کو ہمارا مذہب مبارک ، نہ تم ہم کو تبلیغ کرو نہ ہم تم کو تبلیغ کرتے ہیں ۔ عیسٰی بدینِ خود ، موسٰی بدینِ خود ۔ اور پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت ، آیتِ سیف سے منسوخ ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام تو ہمیشہ تبلیغی مذہب رہا اور رہے گا اسلام میں بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ ہے یٰٓاَیُّھَا الْمُدَّثِّرُ قُمْ فَاَنْذِرْ ہے ۔ اسلام میں عدمِ تبلیغ کا حکم کبھی نہیں دیا گیا ۔

دیکھئے دین کے معنٰی اگر جزا کے لئے جائیں تو کوئی خرابی پیدا ہی نہ ہوگی ۔ مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ کے معنٰی مالکِ روزِ جزا کے ہیں لہذا لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ کے معنٰی ہیں تم کو تمہارے اعمال کی جزا ، اور ہم کو ہمارے اعمال کی جزا ضرور ملے گی ۔ یہ حکم نہ کبھی منسوخ ہوا ہے نہ کبھی منسوخ ہوگا ۔ پورے سورہ کے معنٰی ہیں :

’’ اے پیغمبر ! تم کہہ دو : اے منکرو تم جن کی پوجا کرتے ہو ، میں ان کی پوجا نہیں کرتا ، اور میں جس کی عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرتے ، میرا طریقۂ عبادت جدا ہے ، تمہاری پوجا کا طریقہ علٰحدہ ہے ، تم کو تمہارے اعمال کی سزا ضرور ملے گی ، اور مجھ کو میرے اعمال کی جزا ضرور ملے گی ‘‘ ۔

اب میں ان آیتوں سے بحث کرتا ہوں جن کو حضرت شاہ ولی اللہ بھی منسوخ ماننے پر مجبور ہوئے ۔

کُتِبَ عَلَیْکُمْ اِذَا حَضَرَ اَحَدَکُمُ الْمَوْتُ اِنْ تَرَکَ خَیْرَا نِ الْوَصِیَّۃُ لِلْوَالِدَیْنِ وَالْاَقْرَبِیْنَ بِالْمَعْرُوْفِ حَقًّا عَلَی الْمُتَّقِیْنَ ۔ فرض کیا گیا ہے ، تم پر جب تم میں سے کسی ایک کے پاس موت آجائے ، اگر کچھ مال چھوڑے ، وصیت کرنا ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طور پر ، یہ حکم پرہیزگاروں پر لازم ہے ۔

لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ، حدیث لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ سے منسوخ ہے ، میں عرض کرتا ہوں کہ بھلا قرآن شریف کی

آیت اس خبرِ احاد سے کیونکر منسوخ ہوگی ، لہذا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں ۔ یُوْصِیْکُمُ اللّٰہُ فِیْٓ اَوْلَادِکُمْ (اللہ تم کو اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے) سے یہ آیت منسوخ ہے ، اور حدیث لَا وَصِیَّۃَ لِوَارِثٍ اس نسخ کو بیان کرتی ہے ۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اصل یہ ہے کہ مختلف اقوام میں ترکہ کے متعلق مختلف احکام و وصیتیں ہوتی ہیں ۔ بعض کے پاس مرنے والا جس کے لئے جو وصیت کرے قابلِ نفاذ ہے ۔ بعض کے پاس صرف بڑا بیٹا وارث ہوتا ہے ، بعض کے پاس ترکہ میں عورتوں کو کچھ حصّہ نہیں ملتا ۔ اللہ تعالیٰ پہلی آیت میں یہ تکلیفیں اٹھا کر جننے پالنے والے ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کے متعلق فرماتا ہے کہ وہ بالکل محروم نہیں ہوسکتے ، ان کے متعلق کچھ نہ کچھ وصیت کرنی ضروری ہے ۔ گویا کہ یہ آیت ، آیتِ توریث کی تمہید ہے پھر خدائے تعالیٰ سب کے حصّے مقرر فرماتا ہے ، غیر وارث ، قرابت دار مثلاً پوتا جس کا باپ مر گیا ہو ، بیٹے کے ہوتے محروم ہے نواسہ یا نواسی جس کی ماں مرگئی ہو ، بیٹی کے ہوتے محروم ہے ۔ ان کے لئے اور دیگر امورِ خیر کے لئے باپ بھی ثلثِ مال سے وصیت کرسکتا ہے مگر جن کے حصّے اللہ نے مقرر کئے ہیں ، اللہ نے جن کے لئے وصیت کی ہے ، ان کے لئے مرنے والوں کو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں ۔ اس میں ناسخ و منسوخ کی بحث ہی کیا ہے ۔ ایک آیت میں بعض رشتہ داروں کی اہمیت بتلائی گئی ہے اور دوسری آیت میں ان کے حصّے خود اللہ تعالیٰ نے متعین فرما دیئے ہیں ۔

۲ ۔ اِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ عِشْرُوْنَ صَابِرُوْنَ یَغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا ۔ اگر تم میں بیس صابر سپاہی ہوں تو وہ اپنے سے دس گُنے کافروں پر غالب آجائیں گے ، اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے ۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں یہ آیت بعد کی آیت سے منسوخ ہے ، بعد کی آیت یہ ہے :

اَلْاٰنَ خَفَّفَ اللّٰہُ عَنْکُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِیْکُمْ ضَعْفًا فَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ مِّائَۃٌ صَابِرَۃٌ یَّغْلِبُوْا مِائَتَیْنِ وَاِنْ یَّکُنْ مِّنْکُمْ اَلْفٌ یَّغْلِبُوْٓا اَلْفَیْنِ بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاللّٰہُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ ۔

"اب اللہ نے تم سے تخفیف کردی اور جان لیا کہ تم میں ضعف ہے ، اب اگر تم میں سے سو صابر ہوں تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب آجائیں گے" ۔

میرے خیال میں پہلی آیت کے مخاطب وہ لوگ تھے جو فنِ سپہ گری میں ماہر تھے ۔ ذاتی شجاعت میں ممتاز تھے ، دل میں جوشِ ایمان تھا ، خدا پر اعتماد تھا ۔ اس طرح ان میں ہر طرح کی قدرت تھی ۔ اور دوسری آیت کے مخاطب بعد کے لوگ تھے ۔ سابقین کا ایمان ، ان کی شجاعت ، ان کی سپہ گری بعد کے لوگوں میں کہاں تھی ۔ لہذا بجائے دہ (۱۰) چند کے دو چند سے لڑنے کا حکم دیا گیا ۔ آیت کا دار و مدار ضعف و قوت پر ہے ۔ اگر اب بھی دس مسلمان مشین گن اور بندوق سے مسلح ہوں اور سو دشمن ان سے لڑنے کو تلوار اور لٹھ لے کر حملہ کر رہے ہوں تو اس صورت میں مسلمان قوی ہیں اور ان کو سو دشمنوں کے ساتھ لڑنے سے ہرگز منہ نہ پھیرنا چاہئیے ۔ علت کے بدلنے سے حکم بدل رہا ہے ۔ اعلیٰ قوت کے نہ ہونے کے وقت دہ (۱۰) گنا سے کم قوت کے دونے دشمن سے نہ بھاگنا چاہئیے ۔ پس ناسخ و منسوخ کی بحث ہی کب رہتی ہے ۔

۳ ۔ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا : جنگ کو نکل کھڑے ہو ، خواہ ہلکے پھلکے ہوں یا گراں بار ۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت ،

آیتِ لَیْسَ عَلَی الْاَعْمٰی حَرَجٌ اور لَیْسَ عَلَی الضُّعَفَآءِ سے منسوخ ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مراد خِفَافًا سے یہ ہے کہ ضرورتِ جہاد مثلاً سواری، خادمین، سامانِ خورد ونوش کی مقدار کم از کم موجود ہو، اور ثِقَالًا سے مراد یہ کہ اشیاء وافر ہوں، اب نسخ نہیں رہا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ اِنْفِرُوْا کے مخاطب عام ہیں ان سے معذورین مستثنٰی ہیں اور استثناء نسخ نہیں ہوسکتا۔

۴۔ اَلزَّانِیْ لَایَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْمُشْرِکَةً وَّالزَّانِیَةُ لَایَنْکِحُهَآ اِلَّا زَانٍ اَوْمُشْرِکٌ وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ۔ زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ سے نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک اور یہ تو حرام ہے ایمانداروں پر۔ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت، آیتِ وَاَنْکِحُوْا الْاَیَامٰی مِنْکُمْ (نکاح کرو بے خاوند عورتوں کے) سے منسوخ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ امام احمدؒ نے اس کے ظاہری معنٰے پر حکم دیا، یعنی زناکار عورت سے مردِ متقی کا نکاح حرام ہے بلکہ زانی یا مشرک اس سے نکاح کرسکتا ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ مسلم عورت چاہے زانیہ ہی کیوں نہ ہو، مشرک اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں اور دوسرے ائمہ کے پاس اس کے یہ معنٰی ہیں کہ مرتکبِ کبیرہ زانیہ ہی کا کفو ہوسکتا ہے، یعنی متقی عورت کا کفو زناکار مرد نہیں ہوسکتا۔ اگر کسی عورت نے غیر کفو سے نکاح کرلیا تو، رشتہ داروں کو نکاح فسخ کرادینے کا حق ہے۔ کیونکہ اس سے خاندان کی ذِلّت ہوتی ہے، اور فرماتے ہیں کہ زانی سے نکاح کرنا مستحب نہیں ہے۔ حُرِّمَ کے معنٰی ''مستحب نہیں'' کرنا کچھ دل کو نہیں لگتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں ذٰلِکَ کا اشارہ زنا اور شرک کی طرف ہے نہ کہ نکاح کی طرف۔ اس تاویل پر نکاح زیرِ بحث ہی نہیں رہتا۔ فقیر کے خیال میں اس آیت سے کوئی حکم نہیں دیا گیا بلکہ ظاہر کیا گیا کہ طبعی طور پر بدکار مرد بدکار عورت ہی کی طرف توجہ کرتا ہے۔ اگر حکمِ امتناعی ہوتا تو هِیَ ہوتی اور لَایَنْکِحْ آخر کے جزم کے ساتھ ہوتا۔ مگر قرآن شریف میں تو لَایَنْکِحُ بضمہ آخر ہے۔ نیز جو عورت تائب ہوجائے وہ کَمَنْ لَّاذَنْبَ لَهٗ میں داخل ہوجاتی ہے اور اس آیت کے مصداق سے نکل جاتی ہے۔ ہاں ایسی عورت سے جو اس پیشہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی، نکاح ہرگز دُرست نہیں، کیونکہ یہ نکاح قلتبانی ہوگا۔ نعوذ باللہ۔ یا نکاح کے لغوی معنٰی لیں یعنی جماع۔ پس معنٰی یہ ہوں گے کہ بدکار عورت سے ناجائز تعلقات بدکار مرد یا مشرک رکھ سکتا ہے، ایمان داروں کے پاس تو بدکاری حرام ہے، اس وقت ذٰلِکَ کا اشارہ زنا کی طرف ہوگا۔

۵۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا نَاجَیْتُمُ الرَّسُوْلَ فَقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیْ نَجْوٰىکُمْ صَدَقَةً ذٰلِکَ خَیْرٌ لَّکُمْ وَاَطْهَرُ فَاِنْ لَّمْ تَجِدُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔

''اے ایمان دارو! جب تم سرگوشی کرنا چاہو رسول سے تو اس سرگوشی سے پہلے مسلمانوں کی کچھ مالی امداد کرو، خیر خیرات کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے، پاک تر ہے۔ اگر تم نادار ہو، دینے کے لئے کچھ نہیں پاتے تو اللہ غفور، رحیم ہے۔

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہ آیت، بعد کی آیت سے منسوخ ہے، میں عرض کرتا ہوں کہ اس آیت سے خیرات کی فرضیت کب نکلتی ہے؟ اس میں تو خَیْرٌ لَّکُمْ وَاَطْهَرُ ہے۔ خیریت وطہارتِ صدقہ ناقابلِ نسخ ہے۔ اس میں یہ بھی تو ہے کہ

اگر تم نادار ہو تو اللہ غفور و رحیم ہے ۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں بعض نادان اپنی عزت اور بڑائی ثابت کرنے کو سرگوشی کیا کرتے اور بات کچھ اہم نہ ہوتی تو حکم دیا گیا کہ مسلمانوں کی مالی امداد کر کے خود کو پہلے ہمدردِ مسلمین تو ثابت کرو پھر پیغمبر سے سرگوشی کا ارادہ کرنا ۔ پیسہ تو ہاتھ سے نہیں نکلتا اور راز کی باتیں پیغمبر کو سنانے کا دعویٰ ۔ بعد کی آیت میں ہے کہ اگر پیسہ خیرات نہیں کرتے تو نماز و زکوٰۃ وغیرہ نیک کاموں سے اپنے نیک ہونے کا ثبوت دو ، پھر پیغمبرؐ سے سرگوشی کرنا ۔

صاحبو ! اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام سے فرعون کی تبلیغ کے متعلق فرمایا : فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا ۔ یعنی فرعون کے ساتھ نرمی سے گفتگو کرو ، اسی طرح حبیبِ خدا محمد مصطفےٰ ﷺ سے فرمایا : وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِي هِيَ اَحْسَنُ یعنی بہترین طریقے سے منکرین کے ساتھ مناظرہ کرو ، ان کو سمجھاؤ ، ان مفسرین کے پاس آیتِ سیف سے ، یہ آیت اور ایسی آیتیں جو دشمنوں سے مراعات وحسنِ کلام پر دلالت کرتی ہیں ، سب منسوخ ہیں ، ان کو خیال کرنا چاہئیے کہ جنگ کا وقت اور ہوتا ہے اور تبلیغ و تعلیم کا وقت جدا ۔ حسنِ کلام و حسنِ سلوک کا حکم ہرگز منسوخ نہیں ہوسکتا ۔ جنگ کرنا خلافِ شرافت نہیں ، مگر بدگوئی بیشک خلافِ تہذیب ہے ، اسلام کو بدنام نہ کرو ۔ اس کی تہذیب کو عیب نہ لگاؤ ۔

اس سے زیادہ ظلم ، ان مفسرین کے پاس ایک اور ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض آیتیں تھیں تو قرآن کی مگر ان کے پڑھنے کا اب حکم نہیں ، اور ایسی آیت کو ثابت الحکم اور منسوخ التلاوت کہتے ہیں ۔ مثلاً : اَلشَّيْخُ وَالشَّيْخَةُ اِذَا زَنَيَا فَارْجُمُوْهُمَا ۔ یعنی بوڑھا بڑھیا زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو سنگسار کردو ۔ محصن و محصنہ یعنی شادی شدہ کی سنگساری کا حکم سابقہ مذاہب میں تھا اسلام نے اس کو باقی رکھا کوئی تازہ حکم نہیں دیا ۔ مگر غیر شادی شدہ کے لئے حکمِ جَلْد یعنی دُرّے مارنے کا حکم دیا ۔ اَلزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ میں الف لام عہدی ہے ، اس سے غیر محصن و غیر محصنہ مراد ہیں ۔ قرآن کے غیر محفوظ ہونے کا الزام یہود و ابنائے یہود کے وسائس سے ہے ۔ اس چکر میں بعض سادہ دل علماء آجاتے ہیں ، ذرا یہ بھی غور کرو کہ شیخ کے معنےٰ بڈھے کے ہیں یا شادی شدہ کے ؟ جوان بھی شادی شدہ ہوسکتا ہے اور بوڑھا بھی غیر شادی شدہ ہوسکتا ہے ۔ پھر شیخ کے معنٰی شادی شدہ کے لینا زبردستی ہے ۔ اچھا شیخ کا مؤنث عَجُوْزٌ ہے یا شَيْخَةٌ ۔ اِنِّيْ عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِيْ شَيْخًا ۔ شَيْخَةٌ ۔ کا لفظ کسی شعر میں ، کسی کتاب میں نہیں ہے ، میں اس کو قرآن شریف پر ظلم سمجھتا ہوں ۔ قرآن شریف متواتر ہے ۔ اس سے ایک لفظ زیادہ نہیں ، ایک لفظ کم نہیں ۔ فقیر کو قرآنِ مجید بروایت عاصم کوفی حضرت عثمان ، حضرت علی ، حضرت عبداللہ بن مسعود ، حضرت زید بن ثابت ، حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے جو سب کے سب حفاظ تھے ، متواتر پہنچا ۔ اس معتبر و متواتر روایت کے خلاف فقیر ایک لفظ بھی غیر متواتر ، احاد کا سننا نہیں چاہتا ۔ قرآن شریف کو ناقابلِ اعتبار بنانے کے لئے منافقوں نے یہ فتنے پیدا کئے ہیں ۔ مگر کوئی ان سے پوچھے کہ ایک روایت کی تو تصحیح کرو ۔ متواتر تو کجا خبرِ احاد سے بھی قرآن کے خلاف ایک حکم کا ثبوت ممکن نہیں ۔ قرآن شریف محفوظ ہے ۔ ابتداء سے اب تک حفاظ اور قراء اس کے تواتر کی حفاظت کرتے ہیں ، اس متواتر کے مقابلے میں کوئی روایت کوئی دعویٰ ناقابلِ اعتناء ہے ۔ جس کی خدا حفاظت کرے ، اس میں کسی کو مقدور نہیں کہ کچھ تحریف کرسکے ۔

اللہ تعالیٰ ان دسائس اور ان وساوس سے مسلمانوں کو بچائے ۔ آمین ۔

قرآن اور حدیث کا باہمی تعلق

صاحبو! قرآن شریف تو ہمارے پاس متواتر طور سے پہنچا ہے۔ اس کے متعلق زبان کھولنا، اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَ اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ سے انکار کرنا ہے۔ یہ لوگ تو قابلِ التفات ہی نہیں۔ کوئی مسلمان قرآن شریف کے متعلق شک وشبہ نہیں رکھتا۔ صاحبو! جو شخص یہ کہے کہ میں حدیث کو نہیں مانتا یہ مساوی ہے اس کے کہ میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ کو نہیں مانتا۔ ایسے شخص سے کیا بحث، اور اس پر کیا توجہ کی جاسکتی ہے۔ مگر یاد رکھو! حدیثیں تین قسم کی ہیں۔

(۱) متواتر (۲) مستفیض (۳) احاد۔

(۱) حدیثِ متواتر: وہ حدیث ہے جس کو اتنے لوگ روایت کریں کہ عقلِ سلیم اس بات کو قبول نہ کرے کہ وہ سب جھوٹ پر متحد ہوگئے ہونگے لہذا خبرِ متواتر موجبِ یقین ہے اور اس کے خلاف میں جو روایت ہو وہ منکر ہے، ناقابلِ قبول ہے، رَد ہے۔

متواتر کی بھی دو قسمیں ہیں:

(الف) جس کے الفاظ بلاکم وکاست مروی ہوں اس کو متواتر باللفظ کہتے ہیں۔ جیسے: اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّيَّاتِ اور مَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهٗ مِنَ النَّارِ۔

(ب) متواتر بالمعنٰی: وہ حدیث جس کے مختلف روایتوں کے الفاظ میں کچھ کمی زیادتی ہو مگر ایک ہی مطلب سب سے نکلتا ہو، اس کو متواتر بالمعنٰی کہتے ہیں۔ یہ بھی موجبِ یقین ہے۔ ان احادیث سے انکار، رسول اللہ ﷺ سے انکار ہے۔

(۲) مستفیض: وہ حدیث جو کئی روایتوں سے ثابت ہو مگر حدِ تواتر کو نہ پہنچے۔ ایسی حدیث اگر موجبِ یقین نہیں ہے تو اس سے ظنِ غالب تو ضرور پیدا ہوتا ہے۔

(۳) خبرِ احاد: وہ حدیث جس کی روایتیں مستفیض کی حد کو نہ پہنچی ہوں بلکہ ایک دو آدمیوں نے اس کو روایت کیا ہو۔

سارے جھگڑے خبرِ احاد ہی میں پڑتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام اعظمؒ سے کسی نے کہا کہ بعض حدیثوں میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تین جھوٹ کہے، امام نے فرمایا، نہیں۔ راوی نے ایک جھوٹ کہا، پیغمبر معصوم ہوتا ہے وہ جھوٹ نہیں کہہ سکتا یعنی جھگڑا راوی سے ہے پیغمبر سے نہیں، مگر یہ بھی یاد رکھنا چاہئیے کہ بعض خبرِ احاد کے غلط ثابت ہونے سے تمام احادیث ناقابلِ اعتبار نہیں ہوسکتے۔ ایسے شوشے وہ لوگ چھوڑتے ہیں جن کو نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ایک صاحب، احادیث کو وحیِ غیر متلوسن کر آتش زیر پا ہورہے ہیں۔ غالباً ان کو مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى سے بھی انکار ہے۔ انھوں نے مخالفین اسلام کی کتابوں سے چند اعتراضات جمع کیے ہیں۔ وہ صحاحِ ستہ کا نام تو لیتے ہیں مگر ان کی شروح مثلاً فتح الباری عمدۃ القاری، قسطلانی، نووی اور بذل المجہود وغیرہ کو دیکھنے کی تکلیف نہیں اٹھاتے، ورنہ

ان وساوس کی ان کے دل میں گنجائش نہ ہوتی ۔ آپ سے پہلے بہت سے لوگوں نے اسلام کے خلاف بڑی بڑی کوششیں کیں اور قرآن شریف اور حدیث دونوں کو ناقابلِ اعتبار بنایا مگر کیا ہوا ؟ حق حق ہوا ، ناحق ناحق ۔ ساری کوششیں برباد ہوئیں ، بے سود ۔ اُن کو معلوم ہونا چاہئیے کہ قرآن شریف بلاشبہ بمنزلہ تعزیرات ہند کے ہے اور حدیث شریف بمنزلہ ضابطہ فوجداری کے ۔ عمل بالقرآن حدیث سے معلوم ہوتا ہے ۔ ہم نے ابھی بیان کیا کہ جو حدیث کو نہیں مانتے ان کو نہ نماز کی ترکیب معلوم ہے نہ حج کی ۔ حدیث ہی کی بدولت قرآن پر عمل کرنا آتا ہے ۔ یاد رکھو جس نے تعزیراتِ ہند کو پاس کیا ہے ضابطہ فوجداری کو بھی اسی نے پاس کیا ہے

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَ سَلَّمَ قرآنِ ناطق ہیں ۔ كَانَ خُلُقُهُ الْقُرْاٰنُ ۔ ضابطہ فوجداری کے غلط ثابت کرنے کے بعد تعزیراتِ ہند کے غلط ثابت کرنے میں کیا دیر لگتی ہے ۔ میں یہ نہیں کہہ رہا ہوں کہ ہر ضعیف اور موضوع حدیث کو بھی مان لو ۔ میں اس سے پہلے لکھ چکا ہوں کہ چند احادیث کے غلط یا موضوع ہونے سے مطلق حدیث میں اعتراض نہیں ہوسکتا ۔ نقادانِ حدیث رحمہم اللہ نے حدیث کی بڑی خدمت کی ہے ۔ یہ چراغ تمہاری پھونک سے نہیں بجھے گا : وَيَاْبَى اللّٰهُ اِلَّآ اَنْ يُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُوْنَ ۔ میں صاحبِ مذکور سے عرض کرتا ہوں کہ ایک سیڑھی اور کیوں نہیں چڑھ جاتے ۔ جھگڑا ہی تمام ہوجاتا ہے ۔ نہ قرآن رہتا نہ حدیث اور آپ کی مرادمن مانے حاصل ہوجاتی ہے ۔

بعض منکرانِ معجزاتِ نبوت و اسیرانِ ظلمت کدۂ مادیت اس حدیث کو پیش کرتے ہیں کہ عدم تابیرِ نخل کی وجہ سے کھجور کم لگے میں پوچھتا ہوں کہ آپ تو احادیثِ متواتر کو بھی نہیں مانتے تھے ۔ پھر کس طرح آپ کو اس خبرِ آحاد پر یقین آیا ۔ کیا آپ کی نظر سے وہ حدیث بھی گذری کہ ایک صحابی (حضرت ابو رافعؓ) نے بکری کا گوشت پکایا ۔ حضرتؐ نے فرمایا : ’’ دست دے ‘‘ انھوں نے دیا ۔ پھر فرمایا : ’’دست دے‘‘ انھوں نے دیا ۔ پھر فرمایا : ’’ دست دے ‘‘ انھوں نے عرض کیا : بکری کے دو دست ہوتے ہیں ، وہ تو میں نے دے دیئے ۔ حضرتؐ نے فرمایا : ’’ اگر تو دیتا چلا جاتا تو دست نکلتے چلے جاتے ‘‘ ۔ میں عرض کرتا ہوں ، اس حدیث پر آپ کو کیوں یقین نہیں آیا ۔ جیسی وہ حدیث ہے ویسی یہ بھی حدیث ہے ۔

ان صاحبوں ! کو معلوم ہونا چاہئیے کہ معجزاتِ نبوت حق ہیں ۔ کھجور کی کاشت کرنے والوں کی بے خبری نے معجزہ کو ظاہر نہیں ہونے دیا ۔ خیر ! بعض لوگ کہتے ہیں تیرہ سو برس کے عرصے میں دنیا کیا سے کیا ہوگئی ہے ۔ میں کہتا ہوں کہ اللہ نے اپنے رسولؐ کو جوامع الکلم سے سرفراز فرمایا ہے ۔ ان جوامع الکلم کو موجودہ زمانے پر منطبق کرنے کے لئے عقلِ رسا کی ضرورت ہے ۔ میرا ایمان ہے ، قرآن و حدیث ایسے ہمہ گیر ہیں کہ ہر زمانہ کے تغیرات اور مشکلات کے حل کرنے کے لئے کافی و وافی ہیں ۔

فَمَنْ شَآءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَآءَ فَلْيَكْفُرْ ۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ ۔

اِختلافِ ائمہؒ

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی :

وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِ یَنَّھُمْ سُبُلَنَا ۔

(العنکبوت ۔آیت ۶۹)

وَلَا تَقْفُ مَالَیْسَ لَکَ بِہٖ عِلْمٌ اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ کُلُّ اُوْلٰٓئِکَ کَانَ عَنْہُ مَسْؤُلًا ۔

(بنی اسرائیل ۔آیت ۳۶)

فَسْئَلُوْا اَھْلَ الذِّکْرِ اِنْ کُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ۔

(النحل ۔آیت ۴۳)

فَاعْتَبِرُوْا یٰٓاُولِی الابصٰر ۔

(الحشر ۔آیت ۲)

وَلَوْ رَدُّوْہُ اِلَی الرَّسُوْلِ وَاِلٰٓی اُولِی الْاَمْرِ مِنْھُمْ لَعَلِمَہُ الَّذِیْنَ یَسْتَنْبِطُوْنَہٗ مِنْھُمْ ۔

(النساء ۔آیت ۸۳)

اِنْ جَآءَ کُمْ فَاسِقٌ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْا ۔

(الحجرات ۔آیت ۶)

عَنْ جَابِرٍؓ قَالَ ، قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "اَلَّا سَئَلُوْا اِذَا لَمْ یَعْلَمُوْا فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعَیِّ السُّؤَالُ"۔

(رواہ ابوداؤد و ابن ماجۃ ۔مشکوٰۃ صـ ۵۵)

عَنْ اَبِیْ سَعِیْدِ الْخُدْرِیِّ قَالَ خَرَجَ رَجُلَانِ فِیْ سَفَرٍ فَحَضَرَتِ الصَّلٰوۃُ وَلَیْسَ مَعَھُمَا مَاءٌ فَتَیَمَّمَا صَعِیْدًا طَیِّبًا فَصَلَّیَا ثُمَّ وَجَدَا الْمَاءَ فِی الْوَقْتِ فَاَعَادَ اَحَدُھُمَا

اللہ فرماتا ہے :

اور جو لوگ ہمارے متعلق (ہمارے احکام اور ان کے سمجھنے کے متعلق) کوشش کرتے ہیں ہم ضرور ان کو اپنے راستوں کی ہدایت اور رہبری کرتے ہیں ۔

اور جس کا تم کو علم نہیں ، اس کے پیچھے تم ہرگز نہ پڑو ، بیشک سماعت اور بصارت اور دل ، ان سب سے اس کے متعلق سوال کیا جائے گا ۔

پس اگر تم کو علم نہیں ہے تو اہلِ ذکر (وعلم) سے سوال کرو ۔

دلِ دانا وچشم بینا رکھنے والو ! عبرت لو (الفاظ سے معنٰی کی طرف جاؤ ۔ مجاز سے حقیقت کی طرف پہنچو ، ماخذ سے احکام نکالو ، مجمل سے تفصیل تک چلو ، اصل سے فرع نکالو ، کلی سے جزئی کا حکم دریافت کرو) ۔

اور اگر اس کو رجوع کرتے رسولؐ اور ان میں کے صاحبانِ امر کی طرف تو البتہ جانتے ان میں سے وہ لوگ جو استنباطِ مسائل کرسکتے ہیں (قیاسِ صحیح کرسکتے ہیں) ۔

اگر تمہارے پاس کوئی فاسق کوئی خبر لائے تو تم اس کی تحقیق کرو ۔ (بلا تحقیق اس کی بات کا یقین نہ کرو) ۔

جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا : "کیوں نہیں پوچھ لیا جب جانتے نہ تھے ۔ بے علمی کی شفا سوال ہی تو ہے" ۔

ابو سعید خدریؓ سے روایت ہے کہ دو شخص سفر کو نکلے پھر نماز کا وقت آ گیا اور ان کے ساتھ پانی نہ تھا ۔ پس انہوں نے اچھی مٹی پر تیمّم کرلیا اور نماز پڑھ لی ۔ ابھی وقت باقی ہی تھا کہ

الصَّلٰوۃَ بِوُضُوْءٍ وَلَمْ یُعِدِ الْاٰخَرُ ثُمَّ اَتَیَا رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَذَکَرَا ذَالِکَ فَقَالَ لِلَّذِیْ لَمْ یُعِدِ "اَصَبْتَ السُّنَّۃَ وَاَجْزَءَتْکَ صَلٰوتُکَ" وَقَالَ لِلَّذِیْ تَوَضَّأَ وَاَعَادَ ۔
"لَکَ الْاَجْرُ مَرَّتَیْنِ"۔
(رواہ ابوداؤد والدارمی و النسائی)

ان کو پانی مل گیا، ان میں سے ایک صاحب نے وضو کرکے دوبارہ نماز پڑھ لی اور دوسرے نے نہیں پڑھی۔ پھر وہ دونوں رسولِ خدا ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور واقعہ عرض کیا، جس نے دوبارہ نماز نہیں پڑھی تھی اس سے آپؐ نے فرمایا: "تم نے سنت کے مطابق کام کیا اور تمہاری نماز تم کو کافی ہے" اور جس نے وضو کیا اور دوبارہ نماز پڑھ لی، اس سے فرمایا: "تم کو دو دفعہ اجر ملا"۔

عَنْ عَمْرِو بْنِ الْعَاصِ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ :- اِذَا حَکَمَ الْحَاکِمُ فَاجْتَھَدَ ثُمَّ اَصَابَ فَلَہٗ اَجْرَانِ وَاِنْ حَکَمَ فَاجْتَھَدَ ثُمَّ اَخْطَأَ فَلَہٗ اَجْرٌ۔
(رواہ البخاری تجریدج ۲۔ صـ ۱۰۳)

عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ انھوں نے رسولِ خدا ﷺ کو فرماتے سنا ہے۔ "جب حاکم بعدِ اجتہاد وسعیِ بلیغ کے کوئی حکم کرے اور اگر اس نے صحیح حکم دیا ہے، تو اس کے لئے دو اجر ہیں (ایک کوشش کا اور دوسرے حق رسی کا) اور اگر بعد کوشش کے بھی وہ خطا کر جائے تو اس کو ایک ہی اجر ہے (یعنی اجتہاد و کوشش کا)۔

عَنْ عَبْدِ اللّٰہِ بْنِ عُمَرَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمَا قَالَ قَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَنَا لَمَّا رَجَعَ مِنَ الْاَحْزَابِ "لَا یُصَلِّیَنَّ اَحَدُ نِ الْعَصْرَ اِلَّا فِیْ بَنِیْ قُرَیْظَۃَ"۔ "فَاَدْرَکَ بَعْضَھُمُ الْعَصْرَ فِی الطَّرِیْقِ فَقَالَ بَعْضُھُمْ لَانُصَلِّیْ حَتّٰی نَاْتِیَھَا وَقَالَ بَعْضُھُمْ بَلْ نُصَلِّیْ لَمْ یُرِدْ مِنَّا ذَالِکَ فَذَکَرُوْا ذَالِکَ لِلنَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَلَمْ یُعَنِّفْ اَحَدًا مِنْھُمْ ۔
(رواہ البخاری تجرید صـ ۲۲۳)

عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسولِ خدا ﷺ نے ہم سے فرمایا۔ جب آپؐ جنگ احزاب سے واپس ہو رہے تھے: "کوئی شخص عصر کی نماز بنو قریظہ پہنچنے سے قبل نہ پڑھے"۔ بعض اصحاب کو راستہ ہی میں عصر کا وقت آ گیا پھر ان میں سے بعض نے کہا کہ ہم وہاں پہنچنے سے قبل نماز نہ پڑھیں گے اور بعض نے کہا ہم نماز پڑھ لیں گے کہ حضرتؐ کا مقصد یہ نہیں ہے (بلکہ مقصد جلد پہنچنا ہے) اس واقعہ کو حضرتؐ کی خدمت میں عرض کیا گیا تو آپ نے ان میں سے کسی کو سرزنش (یا ملامت) نہیں کی۔

عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہُ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ "لَا تَقَلَّبُوْا فِی الدِّیْنِ فَاِنَّ الدِّیْنَ لَا یُقَاسُ وَاَوَّلُ مِنْ قَاسَ اِبْلِیْسُ"۔
(رواہ الدیلمی عن علیؓ)

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "دین میں قیاس آرائی نہ کرو کیونکہ دین میں بے وجہ قیاس نہیں چلتا، اور سب سے پہلے ابلیس نے قیاس لڑایا تھا"۔

عَنْ عَلِیٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہا کہ رسولِ خدا

صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ۔ ”نِعْمَ الرَّجُلُ الْفَقِیْہُ فِی الدِّیْنِ اِنِ احْتِیْجَ اِلَیْہِ نَفَعَ وَاِنِ اسْتُغْنِیَ عَنْہُ اَغْنٰی نَفْسَہٗ ۔

(رواہ زرین مشکوٰۃ صـ ۳۶)

ﷺ نے فرمایا: ”اچھا شخص فقیہ فی الدین ہے (یعنی وہ شخص جس کو امور دینیہ میں تفقہ و تدبر حاصل ہو) لوگ اس کے پاس محتاج ہوکر آئیں گے (یعنی اس سے پوچھیں گے) تو وہ نفع پہنچائے گا (مسائل سمجھائے گا)۔ اگر لوگ اس سے بے پروائی کریں گے تو خود کو پہنچائے گا“ (یعنی علم کے مطابق عمل کرکے نفع اُٹھائے گا)۔

عَنْ مُعَاوِیَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ۔ ”مَنْ یُّرِدِ اللّٰہُ بِہٖ خَیْرًا یُّفَقِّہْہُ فِی الدِّیْنِ وَاِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰہُ یُعْطِیْ“۔

(متفق علیہ)

جناب معاویہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہا کہ رسولِ خدا ﷺ نے فرمایا: ”اللہ جس کے ساتھ خیر و بھلائی چاہتا ہے اُس کو دین کا فقیہ بناتا ہے (یعنی امور دینی میں غور و فکر کی توفیق عطا کرتا ہے) اور میں تو تقسیم کرنے والا ہوں اور اللہ ہی عطا کرنے والا ہے“۔

ان آیات و احادیث پر غور کرو کہ ان سے کیا کیا مسائل معلوم ہوتے ہیں؟ اور اختلافِ مذاق سے کس طرح استنباطِ احکام میں فرق پیدا ہوجاتا ہے؟ اور قبولِ حدیثِ ظنی میں اختلاف رونما ہوتا ہے۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ عالم و جاہل دونوں برابر نہیں ہوتے۔ عالم کا بڑا مرتبہ ہوتا ہے۔ جاہلوں کا کام ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو اس کو عالموں سے پوچھیں، ان سے سوالات کریں۔ ان پر اعتماد کریں، ان کے فتووں پر عمل کریں، بلا تحقیق کوئی بات قابلِ تسلیم نہیں ہوتی۔ علماء کو تحقیق و تدقیق کرنی چاہیئے خواہ آیاتِ قرآنی ہوں یا احادیثِ رسول ﷺ۔

مبہم و مجمل امور کی تعمیل میں کوئی صورت اختیار کی جائے تو وہ غلط نہیں ہوتی۔ اختیار تمیزی پر ایک امر چھوڑا گیا، اور اس کی تعمیل مختلف لوگوں نے اپنے اپنے اختیار تمیزی کے موافق کی، تو سب حق پر ہوں گے۔ یہ نہیں کہ ایک حق پر ہو اور سب باطل پر۔ یاد رہے کہ ایک حق پر اور سب باطل پر اسی وقت ہوں گے جب کوئی رائے واقعات پر مبنی ہو، کیونکہ جو امر مطابق واقعہ ہو ”صادق“ ہے اور جو مطابقِ واقعہ نہ ہو ”کاذب“ ہے۔ امر مبہم جو اختیار تمیزی پر موقوف ہو اس کا کوئی واقعہ و محکی عنہ ہی نہیں ہوتا تو مطابق اور غیر مطابق اور صادق و کاذب کی وہاں گنجائش ہی کہاں؟ لہذا اپنے اپنے اعتبار سے سب صحیح و دُرست ہوسکتے ہیں۔

بعض قیاسات کا ماخذ قرآن و احادیث ہوتے ہیں، وہ صحیح اور درست ہیں۔ بعض راویوں کا ماخذ نہ قرآن ہوتا ہے نہ حدیث ہی ہوتی ہے وہ درست نہیں، بعض دفعہ بعض امام قرآن و حدیث سے کسی حکم کا استنباط کرتے ہیں۔ کم فہم اس کے ادارک سے عاجز رہتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ نری رائے ہے، اس کا کوئی ماخذ نہیں ہے۔ حالانکہ ان لوگوں کی نظر اس قدر دقیق نہیں۔

یہ ایک طبعی بات ہے کہ ہر شخص اپنے اساتذہ ، اپنے خاندان ، اپنے شہر کے لوگوں کے حالات سے زیادہ واقف ہوتا ہے ، ان ہی پر زیادہ اعتماد رکھتا ہے اور وہ دوسروں کے تفصیلی حالات سے واقف ہوتا ہے نہ ان پر اعتماد ہی کرتا ہے ۔

یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ایک شخص کو کثرتِ روایت سے یقین یا ظن پیدا ہوتا ہے اور دوسرا راویوں کے ثقہ وفقیہ ہونے کو اہم سمجھتا ہے ۔

امام ابوحنیفہ قرآن کے عام اور مطلق کو اس کے افراد میں یقینی سمجھتے ہیں اور حدیثِ غیر متواتر سے قرآن شریف کی نہ تعیین کرتے ہیں نہ تقیید ۔ کیونکہ ان کی رائے میں موجبہ کلیہ کا نقیض سالبہ جزئیہ ہے ۔ عام ومطلق قرآن کے خلاف اس کے نقیض پر عمل کرنے کو انکارِ قرآن کی تخصیص وتقیید کرتے ہیں اور اس کو حدیث کی خلاف ورزی نہیں سمجھتے ۔ قرآن کی تخصیص وتقیید نہ کرنے والوں کو اہل الرائے اور مخالفِ حدیث سمجھتے ہیں وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ ۔

حضرتؐ کے بہت سے اصحاب مثلاً زبیر ابن العوامؓ الفاظِ نبوی حفظ ہوتے تو روایت کرتے ورنہ نہیں ، یعنی روایت بالمعنٰی کو وہ مناسب نہیں سمجھتے تھے اور بہت سے دوسرے اصحاب روایت بالمعنٰی کو جائز سمجھتے تھے ۔

مالکی لوگ اہلِ مدینہ کے تعاملِ عام کے خلاف کسی دوسرے شہر کا آدمی روایت کرتا تو یہ سمجھتے کہ اس نے گویا تمام خلفائے راشدین اور مرکزِ نبوت یعنی مدینہ اور اس کے رہنے والوں کو جاہل سمجھا ۔ دوسرے مذاہب والے اس کو جائز سمجھتے ہیں کہ اہلِ مدینہ بے خبر رہے ہوں اور دوسرے شہر والوں کو اطلاع مل گئی ہو ۔

حضرت عمرؓ وغیرہ حضرات ہر حکم کی بابت شہادت کے نصاب کے موافق ثبوت طلب کرتے تھے ۔ یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتوں ، کی روایت کے بغیر کوئی حکم ثابت نہیں سمجھتے تھے ۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے کوئی حکم نبویؐ سنایا جاتا اور نصابِ شہادت پورا نہ ہوتا تو قسم دیتے اور قسم کو تکملۂ شہادت سمجھتے ۔

متقدمین ائمہ کے پاس عامتہ الناس آتے اور ان سے سوال کرتے کہ اس مسئلہ میں کیا حکم ہے ؟ ان کو ائمہ پر اتنا اعتماد ہوتا کہ وہ نہ قرآن پوچھتے نہ حدیث ۔ امام جو حکم دیتا اس پر عمل کرتے ، بعض ائمہ ہر سوال کا جواب قال اللہ وقال الرسول سے دیتے ۔ متعلقہ آیات کے سوا متنِ حدیث سنا دیتے اور سند بیان نہ کرتے ۔ ایسی احادیث کو ''مرسل'' کہتے ہیں ۔ حنفی مذہب میں حدیثِ مرسل قابلِ استناد ہے چاہے سند نہ بیان کی گئی ہو مگر راوی یا امام معتمد علیہ اور موثق بہ ہو ۔ محدثین ، احادیثِ مرسل کو تسلیم نہیں کرتے ۔ مگر بخاری شریف میں مقطوعات بکثرت ہیں ۔ امام بخاری ایک حدیث کا ٹکڑا ایک جگہ لکھ دیتے ہیں مگر کسی دوسری جگہ پوری حدیث مع سند بیان کرتے ہیں ۔ امام بخاریؒ استاد وشاگرد کی ملاقات کو ضروری سمجھتے ہیں ، ورنہ حدیث قبول نہیں کرتے ۔ امام مسلمؒ دونوں کے ہم زمانہ ہونے کو کافی سمجھتے ہیں ۔ بعض حضرات صرف حدیثِ صحیح کو قبول کرتے ہیں ۔ اگر تائید میں دوسری حدیث مل جاتی ہے تو اس کو صحیح لغیرہ کہتے ہیں ۔

بعض ضعیف حدیث کو بھی مستحبات میں قابلِ عمل سمجھتے ہیں ۔ اسی طرح ائمہ کے مختلف مذاق ہیں ۔ ہر ایک اپنے مذاق کے موافق حدیث کو قبول کرتا ہے ۔ کوئی امام ایسا نہیں جو بلا تحقیق ، بلا شرط صرف حدیث کا نام سنتے ہی اس پر عمل کرنے کو تیار

ہوجاتا ہو۔ بلکہ فَتَبَیَّنُوْا پر عمل کر کے شرائط کے موافق حدیث تسلیم کرتے ہیں۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ خلافِ حدیث عمل پیرا ہوتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ رسولِ خدا ﷺ اور ہمارے درمیان مختلف قسم کے راوی ہیں، ان کی تنقید ضروری ہے بھلا کوئی مسلمان فرمانِ رسول ﷺ سے سرتابی کیونکر کرسکتا ہے؟ ائمہ کو مخالفِ حدیث سمجھنا صرف زبان درازی ہے۔

صحاحِ ستہ اور دیگر کتبِ احادیث شائع وَ ذائع ہیں۔ حنفی، شافعی، حنبلی، مالکی سب کے سامنے ہیں۔ ان کتبِ احادیث کی اتباع میں علماء نے شرح کی ہے۔ ان پر یہ الزام لگانا کہ باوجود احادیث کے مطالعہ کے اپنے امام کے مذہب پر اڑے رہے سخت سوءِ ظن ہے۔ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ۔

اب ذرا اس پر بھی غور کرو کہ ان چاروں ائمہ کی تقلید شخصی کی جاتی ہے یا یہ چار مذاہب، چار مکتب اور اسکول ہیں جن میں وقت بہ وقت مسائل تحقیق ہوتے رہتے ہیں۔ ثبوتِ حدیثِ صحیح اور عرف کے بدلنے، نئے حالات کے پیدا ہونے کی وجہ سے امام سے اختلاف کیا جاتا ہے۔ ہر مذہب کی فقہ و اصولِ فقہ کی کتابیں ملاحظہ فرمایئے، نہ صرف فروع میں امام سے اختلاف کیا جاتا ہے بلکہ اصول میں بھی۔ تاہم ایک مذہب میں بہ نسبت دوسرے مذہب کے افراد کی قربت اور مناسبت پائی جاتی ہے۔ مثلاً اصولی اختلاف امام ابوحنیفہ اور ان کے شاگردوں امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور امام حسن بن زیاد میں بھی ہے۔ علماء و محققین کبھی امام یوسف کے قول پر کبھی امام محمد کے قول پر اور کبھی امام زفر کے قول پر فتویٰ دیتے ہیں۔ تحقیق کو نری تقلیدِ شخصی سمجھنا اور کسی امام کے متعلق یہ خیال کرنا کہ وہ احادیثِ صحیحہ کو نہیں مانتے، اپنی جہالت کا ثبوت دینا ہے۔

یہ بھی تو غور کرو کہ مسائلِ شرعیہ کے حل کرنے والے کتنے قسم کے عالم ہیں؟ ہر قسم کے عالم کے لئے کس قسم کی معلومات کی ضرورت ہے؟ عربی ادب کی بہر صورت ضرورت ہے، عربی کے لئے لغت، محاورات، نحو، صرف، معانی، بیان سے واقفیت کی حاجت ہے، قرآن شریف اور اس کے لئے تفسیر و اصولِ تفسیر کی احتیاج ہے، حدیث اور اس کے لئے اُصولِ حدیث، اسمائے رجال کا علم لابد ہے۔ فقہ اور اس کے لیے اصولِ فقہ۔ منطق۔ اجماعی مسائل و اختلافِ ائمہ سمجھنے کے بغیر چارہ نہیں۔ زمانے کے نئے نئے مسائل سے واقفیت، اسرار و مقاصدِ دین، عرف، عامتہ البلوٰی غرض کہ بیسیوں امور کے جاننے کے بعد کہیں ایک حکمِ شرعی معلوم کیا جاسکتا ہے۔

علماء میں بعض **مجتہدینِ مطلق** ہوتے ہیں، وہ مستقل صاحب الرائے ہوتے ہیں، ان کا ایک خاص مذاق ہوتا ہے، ان کا ایک خاص اجتہاد، خاص طرزِ استدل ہوتا ہے۔

بعض **مجتہد فی المذہب** ہوتے ہیں، استاد کا ان پر بڑا اثر رہتا ہے۔ کہیں کہیں استاد سے اصولی اختلاف بھی رکھتے ہیں۔ فروع میں اپنے اجتہاد پر رہتے ہیں۔ **مجتہد فی المسئلہ** کوئی نئی صورت پیدا ہوجائے تو اس کا جواب دے سکتے ہیں۔ احادیث پر غور و فکر کرتے ہیں۔ کوئی حدیث صحیح ثابت ہوتی ہے تو اپنے اساتذہ کے خلاف اس پر فتویٰ دیتے ہیں۔ صحیح عمل کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔

اصحابِ استنباط خود قرآن و احادیث سے ذاتی تحقیق نہیں کرسکتے، مگر اپنے مذہب کے کلیات سے تفریعات کرتے ہیں۔

جزئیات کا حکم نکالتے ہیں، اصحابِ ترجیح جن میں قوتِ تمیز کم ہوتی ہے، مختلف اقوال میں سے ایک قول کو ترجیح دیتے ہیں۔

بعض مفتی کہلاتے ہیں، جو فقہ کی کتابوں سے جزئیات نکالتے ہیں۔ یہ لوگ اصل میں ناقل ہوتے ہیں، ذاتی کوشش صرف اس قدر ہوتی ہے کہ کتابوں میں سے تلاش کر کے مسئلہ کا جواب نکالتے ہیں۔ ان کے خیال میں تحقیقات و استنباط کا دروازہ بند ہوگیا ہے۔ ہر نئی بات ناجائز و حرام سمجھتے ہیں۔ یہ شافعی میں بھی ہیں، مالکی میں بھی اور حنبلی میں بھی اور حنفی میں بھی۔

صحابہؓ کے زمانہ میں اختلاف آراء ہوتا تھا مگر باہم ایک دوسرے کو باطل، بے دین نہیں سمجھتے تھے۔ ائمہ باوجود باہمی اختلافات کے ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔

افسوس! یہ کیسا زمانہ آ گیا ہے؟ آمین بالجہر اور رفع یدین کرنے والوں کی مسجد جدا، اور حنفی و شافعی کی مسجد الگ۔ ایک دوسرے کے پیچھے نماز پڑھنے سے انکار کرتے ہیں۔ آپس میں مقدمہ بازی کرتے ہیں، اور غیر مسلم حکام جو فیصلہ کریں اسے تسلیم کرتے ہیں۔

ایک دفعہ بغداد شریف میں مسجد غوثیہ میں فقیر نے مغرب کی نماز پڑھی۔ حنفیوں اور حنبلیوں کی دو جماعتیں صف کے بازو صف لگا کر بہ یک وقت نماز پڑھ رہی تھیں۔ اللہ اکبر کی آواز سن کر انسان حیران ہوجاتا ہے کہ یہ ہمارے امام کی آواز ہے یا دوسرے امام کی۔ عبدالعزیز سعودی نے ایک نماز کے لئے حنفی اور ایک نماز کے لئے شافعی، ایک کے لئے حنبلی اور ایک کے لئے مالکی امام مقرر کیا ہے اور تمام مذاہب والوں کو اسی امام کے پیچھے نماز پڑھنی ہی پڑتی ہے۔

یہ ایک طبعی بات ہے کہ نادان، دانا سے، جاہل، عالم سے پوچھتا ہے اور اس کے کہے پر اعتماد کرتا ہے اور حکم بھی یہی ہے فَاسْئَلُوْآ اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ اہلِ علم سے سوال کرو اگر تم کو معلوم نہ ہو۔ دیکھو! ''اِسْئَلُوْا'' امر ہے وجوب پر دلالت کرتا ہے۔ حضرتؒ فرماتے ہیں: اَلَّا سَئَلُوْا اِذَا لَمْ يَعْلَمُوْا فَاِنَّمَا شِفَاءُ الْعَيِّ السُّؤَالُ؛ کیوں نہیں سوال کیا جب جانتے نہ تھے۔ عاجز و ناواقف کا علاج سوال ہی ہے۔ دیکھو ساری دنیا میں یہی ہوتا ہے، ماہرین پر اعتماد کرتے ہیں۔ جب تک خود کو مہارت نہ ہو دوسروں کی تقلید کرتے ہیں۔ مشکلات پیش آتی ہیں اور خود کو عاجز پاتے ہیں تو فوراً تقلید کرنی ہی پڑتی ہے۔ بے علمی، پھر خود مختاری، تباہی کا موجب ہوتی ہے۔ دیکھو حساب، معمولی فن ہے مگر ایک زمانہ تک کسی استاد کے زیرِ تعلیم رہتے ہیں، اور وہ جوابات کی غلطی بتلاتا رہتا ہے تو کہیں صحیح جواب لکھنا نصیب ہوتا ہے۔ ضروری و موقوف علیہ علوم تو کچھ بھی نہیں، اور آزادی، ذاتی رائے کا ادعاء، اچھے آدمی کا کام نہیں۔ عربی کی چار سطریں صحیح نہیں پڑھ سکتے اور بن گئے اہلِ حدیث، کسی ناقص نے کہہ دیا: حدیث میں اس طرح آیا ہے، بس اس پر اعتماد کرلیا۔ نہ تحقیق نہ تدقیق، آخر تقلید کس ہوّے کا نام ہے، دوسرے پر اعتماد کرنا ہی تو تقلید ہے۔

بہر حال مجتہد کے لئے ادب، نحو، صَرف، قرآن، تفسیر و حدیث وفقہ، حدیث کے لئے اسماءِ رجال اور سیرتِ نبوی تاریخ و اصولِ حدیث، فقہ کے لئے اصولِ فقہ، محاورات و عادات و عرفِ زمانہ، اسرار و حکمِ دین سے واقف ہونا ضروری ہوتا ہے۔ ایک آدھ حدیث کی مترجم کتاب دیکھ لی، نہ راویوں کے حال سے واقف نہ ناسخ و منسوخ معلوم، نہ دیگر احادیث سے واقفیت، نہ کسی قسم کی تطبیق و استنباط کی قوت حاصل اور لگے خود کو مجتہد سمجھنے۔ خدا کو جواب دینا ہے فَاسْئَلُوْآ اَهْلَ الذِّكْرِ

پر عمل کر کے ٹھنڈے دل بیٹھے رہنا موجبِ امن ہے ۔ اس مقام پر کئی غلط فہمیاں ہو رہی ہیں ، کیا اب کوئی مجتہد نہیں ہوسکتا ؟ یہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم اور رحمت و فیضانِ علم کا محدود کر دینا ہے ، مگر زمانۂ نبوت سے بُعد ، بدشوقی اور قلتِ وسائل کی وجہ سے نایاب ہے ۔ ذرا یہ بھی تو سوچو ، مجتہد کے کتنے اقسام اور درجات ہیں ۔

اوّل : مجتہدِ مطلق ، صاحبِ اصول ۔ اس کا طریق استنباط و استدل جدا ہوتا ہے ۔ جیسے امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمتہ اللہ علیہ ۔

دوم : مجتہد فی المذہب ۔ اس کے اصولِ استنباط وہی ہوتے ہیں جو اس کے شیخ کے ہوتے ہیں ۔ مگر مسائل میں وہ اپنے شیخ کا خلاف بھی کرتا ہے ۔ عام طور سے لوگ شاگردانِ امام کو مجتہد فی المذہب سمجھتے ہیں ۔ مگر علمِ اصولِ فقہ کا واقف جانتا ہے کہ صاحبین یعنی امام ابو یوسف رحمتہ اللہ علیہ اور امام محمد بن حسنؒ خصوصاً اصولی اختلاف بھی رکھتے ہیں ، مگر یہ کم ہے اکثر اصول میں امام کے موافق ہیں ۔

سوم : مجتہد فی المسئلہ ۔ کسی خاص مسئلہ میں صاحبِ تحقیق ہوتا ہے ، یا اگر کوئی نیا واقعہ پیدا ہو تو حکم کا استنباط کرتا ہے ۔ اس مسئلہ کا جواب دیتا ہے ۔ مجتہد فی المسائل کا ہر زمانے میں رہنا ضروری ہے ، ورنہ دین کے کام بند ہو جائیں گے ۔

چہارم : صاحبِ ترجیح ۔ مجتہدینِ سابق کے مختلف اقوال میں سے ایک کو ترجیح دیتا ہے ۔ سب کے آخر میں مفتی کا درجہ ہوتا ہے ۔ یہ اجتہاد نہیں کرسکتا ۔ کتابیں اُلٹ پلٹ کر کے کسی نہ کسی کا قول نکال دیتا ہے ۔ عام طور پر علماء ایسے ہی پائے جاتے ہیں ۔

ایک اور غلط فہمی بھی عام طور سے چھائی ہوئی ہے ۔ حنفی ، شافعی ، مالکی ، حنبلی ، تقلیدِ شخصی کرتے ہیں ۔ یہ بالکل غلط ہے ۔ یہ چار خاندان یا اسکول ہیں ۔ ہر خاندان کا مذاقِ استنباط جُدا ہے ۔ وقت بہ وقت تحقیقات ہوتی رہتی ہیں ۔ شاگردانِ امام نے بعدِ تحقیق ، اصول میں بھی مخالفت کی اور فروع میں تو بکثرت اختلاف ہے ۔ علماء نے بعدِ تحقیقات امام کی اور صاحبین کی مخالفت کی اور جُدا فتوے دیئے ۔ یہ تمام تحقیقات ایک جگہ جمع کی جاتی ہیں اور انھیں ’’ فتاوٰی ‘‘ کہتے ہیں ۔

اور تینوں مذاہب کا بھی یہی حال ہے ۔ ان میں بھی ہر قسم کے مجتہد اور ان کی تحقیقات ہیں ، یہ اپنا اپنا مذاق ہے ۔ خشیۃ اللہ سب میں ہے ، حق رسی کے لئے سب کوشاں ہیں ، مختلف فیہ مسائل میں جنگ و جدل اہلِ علم کا کام نہیں ۔ لِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوْا الْخَيْرَاتِ (ترجمہ : ہر ایک کے واسطے ایک رُخ ہے جس کی طرف وہ مڑتا ہے) تم اچھے کام کرنے کے لئے دوڑو ، اب رہ گئی تلفیق ، یعنی بلا تحقیق ایک بات ایک امام کی لے لی ، اور دوسرے امام سے دوسری بات ۔ ایسے شخص کا کام باتفاقِ تمام ائمہ باطل ہے یعنی اس کا بطلان اجماعِ مخالف سے ہے ۔ کیونکہ یہ کسی کے اصول کے موافق نہیں ۔ اس کی مثال ایسے شخص کی ہے جو ایک دوا ڈاکٹر کی ، ایک دوا ہومیوپتھی کی ایک دوا طبِ یونانی کی ، اور ایک دوا ویدک کی ملا کر کھاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ان ادویہ کا مرکب ڈاکٹر کے پاس درست ہے نہ طبیب کے پاس ۔ ہر شخص کا ایک طریقِ علاج ہے اور یہ مرکب سب کے اصول کے خلاف ہے ۔ یہ جاہل بندۂ غرض ہے ، اپنی خواہشات کا غلام ہے ، وہ حقیقت میں ائمہ کا نام برائے نام لیتا ہے ۔

تصوّف

اب اس پر غور کرو کہ تصوف ہے کیا چیز ؟ خدا کی ذات اور اس کے صفات اور بندوں سے اس کا ربط کن کن علوم میں بیان کیا جاتا ہے ۔ متکلم یعنی علمِ کلام جاننے والا ان چیزوں پر عقلِ سلیم سے غور کرتا ہے ۔ صوفی بھی انھیں سے بحث کرتا ہے ، مگر روحانی قوت سے ۔ خدائے تعالیٰ کی ذات اور اسماء و صفات سب قدیم ہیں ۔ ان پر عقل والے اور کشف و اشراق والے سب ہی غور کرتے ہیں ۔ اصل چیز قدیم رہتی ہے مگر بیان کرنے والے اصطلاحات مقرر کرتے ہیں ۔ ان اصطلاحات کے نئے ہونے سے اصل شئے نئی نہیں ہوجاتی ۔ ہر شخص اپنی طرز اور نظریہ سے اصطلاح بناتا ہے ۔ اللہ اور اس کے صفات کے متعلق تمام پیغمبر تقریباً ایک ہی بات کہتے ہیں ۔ جس طرح چارمینار کو جو دیکھتا ہے ایک ہی کہتا ہے کیونکہ وہ سینکڑوں سال سے جوں کا توں کھڑا ہوا ہے ۔ ہندو دیکھے ، پارسی دیکھے ، انگریز دیکھے ۔ جو دیکھے سب کا بیان ملتا جلتا رہتا ہے ۔ مگر سب کی قوتِ نظر ایک درجہ پر نہیں ہوتی ۔ ہر ایک اپنے حوصلہ کے مطابق سمجھتا ہے ۔ متکلم سے پوچھئے وہ کہتا ہے : خدا ایک ہے اور اس کے صفات قدیم ہیں ۔ صوفی بھی کہتا ہے کہ خدا اور اس کے صفات قدیم ہیں ۔ مثال کے طور پر ایک آیت لیجئے :- ''هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ''۔ متکلم نے اللہ تعالیٰ کے متعلق کہا وہ سب سے پہلے تھا ، اس کا وجود بالذات ہے ، اس کے سوا جتنے ہیں ، حادث ہیں ، وہ اپنی ذات کے لحاظ سے قدیم ہے ، اوّل ہے اور صفات کے لحاظ سے ظاہر ہے ، آخر ہے اور وہ ذات کے لحاظ سے باطن ہے ، آثار کے لحاظ سے ظاہر ہے ۔ صوفی کہتا ہے هُوَ سے مراد ''ذاتِ واحد'' ہے ۔ اوّل و آخر ، ظاہر و باطن ، یہ سب اس کے وجود کے درجے ہیں ۔ اس کو صوفی ''وحدتِ مطلقہ'' کہتے ہیں اور ''ذات'' کو بغیر لحاظِ صفات کے ''احدیت'' کہتے ہیں اور صفات کے لحاظ سے ''واحدیت''۔

صوفی کے پاس اصل صفات سات ہیں :- حیاتؔ ۔ علمؔ ۔ سماعتؔ ۔ بصارتؔ ۔ قدرتؔ ۔ ارادہؔ ۔ کلامؔ ۔ متکلم خدا اور بندے کے ربط کے جاننے میں عاجز ہے ، صوفی کہتا ہے ، اصل خدا کی ذات بالذات ہے تو یہ سب بالعرض چیزیں اس سے غیر نہیں ۔ بالذات کے بغیر کوئی بالعرض موجود نہیں ہوسکتا ۔ وہ صاف صاف کہتا ہے :

یہ سب روپ تیرے ، تو بہروپیا ہے تو ہر رنگ میں رہ کے سب سے جُدا ہے (حسرتؔ صدیقی)

کیا یہی معنٰی آیت هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ سے نہیں نکلتے ؟ صوفی رات دن اللہ کو یاد کرتا ہے ، اور اس کو تجربہ و احساس ہوتا ہے کہ خدا کے سوا موجود بالذات کوئی اور نہیں ، آخر تصوف اور کیا ہے ؟

دوسری قوموں کی معلومات کے تو ''ہادی مہدی'' اور ''ہارون رشید'' کے زمانے میں ترجمے ہوئے ۔ کیا قرآن بھی اسی زمانے میں لکھا گیا ؟ **لاحول ولا قوۃ الا باللہ** ۔

بہر حال ابتدائے زمانہ سے صوفی اور متکلم خدا کو ، اس کے صفات کو ، قرآن سے سمجھ رہے ہیں مگر ع

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

کیا مسلمانوں نے یونانیوں سے یا ہندوؤں سے یا پارسیوں سے تصوف لیا ہے ؟ یہ سب غلط ہے ۔ خدائے تعالیٰ قدیم ہے اور

اس کے سمجھنے والے بھی ہمیشہ سے موجود ہیں ۔ لوگوں کے بے تحقیق بات کہنے سے کیا ہوتا ہے ۔

ابھی ہم نے بیان کیا کہ تمام پیغمبر ذات و صفاتِ الٰہی کو جانتے تھے اور مسلمان بھی ہمیشہ سے جانتے ہیں ۔ کیا تصوف خدائے تعالیٰ کی ذات و صفات کو جاننے کے سوا کچھ ہے؟ ہرگز نہیں ۔ اس وقت تو میں نے چند اشارے کردیئے ہیں ۔ تصوف پر میرے متعدد رسالے ہیں اور انشاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں اس پر تفصیل سے لکھتا رہوں گا ۔ یہ بات یاد رہے کہ اللہ کے نام کا اس کی تمام خصوصیات کے ساتھ کسی زبان میں ترجمہ نہیں ہوا ، پھر دوسروں سے تصوف لینے کے کیا معنٰے ؟ یہ خاتم النبیین کا مذہب ہے ۔ یہ ''اَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِىْ '' کی عنایت ہے ۔ مسلمانوں سے زیادہ خدا کو جاننے والا کوئی نہیں ۔ کوئی بُت پرستی کرتا ہے ، کوئی نور اور روشنی کی پوجا کرتا ہے ۔ کوئی فعل و انفعال ، باپ بیٹا ، روح القدس ، مادہ وصورت ، جیو اور خلو کا قائل ہے ۔ توحید تو صرف مسلمانوں کا حصّہ ہے ۔

جس کو مزید تحقیقات کی ضرورت ہو وہ میری حسبِ ذیل کتابیں دیکھے :

(۱) مراۃ الحقائق (۲) حکمتِ اسلامیہ (۳) شرح وترجمۂ فصوص الحکم (۴) مکاتیبِ عرفان ۔

لغاتِ قرآنی

قرآن شریف کے لغات کے متعلق بھی دوسرے حضرات میں اختلاف ہے :-

صاحبو ! ترجمہ کرنے کے وقت میں اس پر غور کرلیتا ہوں کہ ہر لفظ کے معنٰی کیا ہیں ۔ اصل میں باعتبار مادّہ کے کیا معنٰے ہیں اور عام طور سے کیا معنٰے لئے جاتے ہیں ۔ میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنٰے لیتا ہوں ۔ اشتقاق کے لحاظ سے اور عام فہم ۔ بعض دفعہ عربی لفظ کے معنٰی اُردو کا ایک لفظ ادا نہیں کرسکتا ۔ اس واسطے کئی لفظ لکھتا ہوں کہ ان کے مجموعے سے قرآن کے معنٰے سمجھے جائیں ۔ میں اس بات کی بھی کوشش کرتا ہوں کہ اُردو میں اس عربی لفظ کے قریب قریب کیا الفاظ مستعمل ہیں تاکہ قرآن پڑھنے والوں کو معلوم ہوجائے کہ اس کے ہم معنٰی لفظ سے تو ہم اوّل ہی سے واقف ہیں ۔ ترجمہ کرنے میں عربی زبان کے محاورات سے ایسے معنٰے لیتا ہوں جو مخالفینِ اسلام کے اعتراض سے پاک ہوں اور جس سے اسلام پر کوئی کمزوری یا برائی عائد نہیں ہوتی ، مثلاً ''تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ '' لوگ اس کے معنٰی کرتے ہیں : ''ہاتھ ٹوٹیں ابولہب کے اور وہ مرجائے'' ۔ عرب لوگ کہتے ہیں : ''مَالِىْ يَدَانِ فِىْ هٰذَا الْاَمْرِ '' یعنی مجھے قوت جارحہ ہے نہ دافعہ ۔ اُردو میں کہتے ہیں ، کہ میں بے دست وپا ہوں ، یعنی بے سر و سامان ۔ میرے دونوں ہاتھ ، میری دونوں قوتیں یعنی جارحہ و دافعہ بیکار ہیں ۔ لہذا میں نے ''تَبَّتْ يَدَآ اَبِىْ لَهَبٍ وَّ تَبَّ '' کے معنٰے یہ کئے کہ '' ابولہب نے اسلام کے خلاف جتنی کوششیں کیں وہ سب ناکام ہوگئیں ۔ ابولہب کی جارحانہ اور دافعانہ قوتیں بیکار ہوگئیں ، آخر وہ خود بھی تباہ ہوگیا ۔ حَمَّالَةَ الْحَطَبِ : کے معنٰی فتنہ انگیز ۔ جلتی آگ میں لکڑیاں ڈالنے والی کے ہیں اور فِىْ جِيْدِهَا حَبْلٌ مِّن مَّسَدٍ کے معنٰی یہ کہ اس کی شرارت اس کے گلے کا ہار ہوگئی ۔

تمام ترجمے میں میں نے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ عربوں کے محاورہ کے مطابق معنٰے اختیار کئے جائیں ۔ اس ترجمہ اور تفسیر میں فقیر نے ممکن کوشش کی ہے کہ مخالفینِ اسلام کے اعتراضات کا جواب دے ۔ یہ کام علمِ کلام کا ہے ، زمانہ بدل

گیا ہے پہلے زمانے کے معترضین باقی نہیں رہے ، اس زمانے کے مخالفین جدا ہی اعتراض کرتے ہیں اور ان کے جوابات بھی ان کے لائق ہونے چاہئیں ۔ ایسے اعتراض جہاں پر ہیں میں ہرگز ان کی توجیہ نہیں کرتا ، جن کی نہ ضرورت ہے اور نہ وہ معترضین اب باقی ہیں ۔ بیرونی دشمن ایک طرف ، اندرونی دشمنوں نے بہت سر اُٹھایا ہے ، ان کے جوابات میں نے تفسیرِ صدیقی میں دیئے ہیں ۔ خصوصیت سے سورہ فاتحہ کی تفسیر میں ۔ اندرونی مخالفین کی میں نے خوب تردید کی ہے ، ایک دفعہ اندرونی مخالفین نے ایک محضر تیار کر کے گریکسن صاحب (جو حکومت حیدرآباد کے صدر المہام کو توالی اور امور عامہ تھے) کے سامنے پیش کیا ۔ صاحبِ مذکور نے پوچھا کہ انھوں نے کیا کوئی پمفلٹ لکھا ہے ؟ جواب دیا ''نہیں'' کہا ۔ پھر یہ تحریر جس کی تم شکایت کر رہے ہو ، کہاں ہے ؟ کہا گیا کہ تفسیرِ صدیقی میں ہے ۔ گریکسن صاحب نے کہا : '' وہ تفسیر میں اپنے خیالات اپنا مذہب نہ بتائے گا تو کہاں بتائے گا ۔ یہ لوگ اس کی تفسیر دیکھتے ہی کیوں ہیں ؟ پھر کہا کہ ایسے مہمل محضر ہرگز میرے سامنے پیش نہ کئے جائیں ۔ اور اللہ نے مجھے مخالفین کے شر سے بچا لیا ۔

تفسیر ہذا میں ، میں نے بہت سے اہم مسائل کو حل کیا ہے مثلاً جزیہ ، میں اس کو جزائے حفاظت سمجھتا ہوں اور تعدد ازدواج کو مبنی بر ضرورت سمجھتا ہوں اور غلاموں کو اسیرانِ جنگ ۔ یہ سب بحثیں دیکھنے کے قابل ہیں ۔ جابجا ان مسائل کو جس قدر تحقیق سے بیان کرسکتا تھا میں نے کیا ہے ۔

صاحبو ! ایک میرا خیال ہے ، وہ یہ کہ زمانہ گردش کر رہا ہے ۔ مسلمانوں پر کبھی مکّی حالت ہے اور کبھی مدنی ۔ جیسی حالت ویسا حکم ۔ اس زمانے میں ہم مکّی حالت میں ہیں ، اس وقت ''فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ کا حکم نہیں دیا جاسکتا ۔ بلکہ وَلَا تُلْقُوْا بِاَيْدِيْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ کا حکم دینا چاہئیے ۔

شانِ نزول

فقیر نے تفسیرِ صدیقی میں بہت کم جگہ اسبابِ نزول بیان کئے ہیں ، میں قرآن شریف کو '' مُبِيْن '' سمجھتا ہوں ۔ اس کا سمجھنا قصّہ کہانیوں پر موقوف نہیں ۔ قرآن شریف کوئی تاریخی کتاب نہیں ہے ۔ کوئی واقعہ بیان نہیں کیا جاتا ، مگر اس کی غرض عبرت اور نصیحت اور بری باتوں سے روکنا ہوتی ہے ، قرآن شریف کا کام ہے ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ۔ لوگ اِدھر اُدھر کے قصّوں سے تفسیر کو کئی کئی جلدوں میں کر دیتے ہیں ۔

ربطِ آیات

میری بڑی کوشش ربطِ آیات ہے ۔ ایک رکوع کو دوسرے رکوع کے ساتھ مرتبط کرنا ۔ قصّوں کو قصّوں سے ملانا ۔ اصل میں قصّے تو ہیں ہی نہیں ، نتیجہ خیز واقعات ہیں ۔ اس واسطے ربطِ آیات کی وجہ سے بعض بعض جگہ کچھ حذف ہے کچھ مقدر ہے ۔ عربی زبان کے لحاظ سے ان میں ربط پیدا کرنا ضروری ہے ۔ ایسا حذف قرآنی اسلوب کے لوازم سے ہے ۔ عرب لوگ جہاں حذف کیا کرتے تھے اسی طرح قرآن میں بھی کیا گیا ہے ۔ اس حذف و تقدیر کا مزہ اُسی کو ملتا ہے جو عربوں

کے طرزِ بیان اور اسٹائل سے واقف ہو، جہاں حذف کیا گیا ہے اگر محذوف بیان کردیا جائے تو وہ جملہ بالکل بھدّا ہوجائے گا، اس کا بانکپن اور حسن باقی نہیں رہے گا۔

قصصِ قرآن

قرآن شریف میں آدم علیہ السلام اور شیطان، موسٰی علیہ السلام اور فرعون کے قصّے بار بار بیان کئے گئے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے قصّہ سے فضیلتِ علمی کا اظہار مقصود ہے، اور یہ بھی کہ انسان خواہ کتنا ہی بڑا کیوں نہ ہو اس سے لغزش ممکن ہے۔ شیطان کا تکبر، اپنی خیالی برتری کی وجہ سے دوسروں کو ذلیل سمجھنا اور پھر خدا کے حکم کو بھی نہ ماننا اور یہ سمجھنا کہ خدا بھی غلطی کرتا ہے، اور اعلیٰ کے رہتے ہوئے ادنیٰ کو حکومت وعزّت دیتا ہے، چونکہ دنیا میں صبح سے شام تک یہی ہوتا رہتا ہے، اس لئے خدائے تعالیٰ آدم علیہ السلام کے قصّے کے ذریعہ آدمیوں کو عبرت دلاتا ہے۔

موسٰی علیہ السلام کے قصّے سے بہت کچھ عبرت لی جاسکتی ہے۔ مادرِ موسٰی علیہ السلام کا صاحبِ الہام ہونا، عورتوں کو جرأت دلاتا ہے کہ وہ بھی محنت کریں گی، خدا کی یاد کریں گی تو وہ بھی صاحبِ الہام ہوسکتی ہیں، مادرِ موسٰی علیہ السلام کا یقین اور اللہ پر اعتماد کیسا ہے کہ اکلوتے بیٹے کو صندوق میں ڈال کر ندی میں بہا دیا۔ وہ صندوق فرعون کے گھر پہنچا۔ فرعون کی بیوی نے بچے کو نکال لیا۔ جو خدا پر بھروسہ کرتے ہیں، ان کی اولاد کو خدا ضائع نہیں کرتا۔ فرعون جیسے سرکش بادشاہ کے گھر میں آسیہ اس کی بیوی کیسی نیک اور اچھی نکلی۔ موسٰی علیہ السلام کے قصّے میں قدم قدم پر نصیحت اور عبرت ہے۔ اسی واسطے ان کے قصّے کو بھی اللہ تعالیٰ نے متعدد جگہ بیان فرمایا۔

تکرارِ آیات کا فائدہ

بعض بعض جگہ ایک ہی آیت کو متعدد بار دہرایا گیا ہے۔ اس کا لطف تو ان کو ملتا ہے جو عربی کا صحیح مذاق رکھتے ہیں، مثلاً صرف سورۂ رَحْمٰن کی اسی ایک آیت کو لے لیجئے ”فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّکُمَا تُکَذِّبٰنِ“۔ ایک جاہل قرآن کا خلاصہ کرنے بیٹھا اور اس نے مکرر آیتوں اور قصوں کو نکال دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا، نہ قرآن کا اسٹائل باقی رہا اور نہ اس کا حسن۔ قرآن کی حالت یہ ہے کہ ایک لفظ کی جگہ اس کا مترادف رکھیں تو درست نہیں۔ قرآن کی عبارت میں ایک ایک لفظ اپنی جگہ ایسا جما ہوا ہے جیسا انگشتری میں نگینہ۔ ایک نگینہ کی جگہ دوسرا نگینہ نہیں رکھ سکتے۔ جہاں فعل، فاعل ہیں وہ مبتدا خبر نہیں بنائے جاسکتے۔ ایک ہی قصّے کو متعدد جگہ بیان کرنا اور ہر جگہ ایک نیا ہی لطف پیدا کرنا۔ یہ اعلیٰ درجہ کے فصیح و بلیغ کا کام ہے۔

قرآنی قسمیں

قرآن شریف میں جابجا قسمیں ہیں، کوئی قسم قرآن میں ایسی نہیں جس سے فائدہ خاص حاصل نہ ہو، بعض مفسرین نے ”وَالتِّیْنِ وَالزَّیْتُوْنِ وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ وَھٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنَ“ کی تفسیر میں انجیر کے خواص اور فوائد بیان کرنے شروع کردیئے،

زیتون کے خواص بیان کرنے لگے ، کوہِ طور کی تعریف کرنے لگے ۔ کیا یہ طب کی کتاب ہے ؟ کہ دواؤں کے خواص اور فوائد بیان کئے گئے ہیں ۔ باغِ تینؔ دمشق میں ہے ، جبلِ زیتونؔ بیت المقدس میں ہے ، کوہِ طورؔ موسٰی علیہ السلام کے لئے تجلّی گاہ کا نام ہے ۔ اصل یہ ہے واؤ اور بـــا کے معنٰی ''اور'' اور'' ساتھ'' کے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ شہادت پیش کررہا ہے ۔ قسم کیا ہے؟ شہادت ہے ۔ اُردو کا ایک شاعر کہتا ہے : ع

خدا شاہد ، خدا شاہد یہ کیوں کہتے ہیں وعدوں پر

لوگ کہتے ہیں : '' اللہ گواہ ہے''۔ یہ بھی قسم ہے ۔ اسی طرح خدائے تعالیٰ اس سرزمین کو شہادت میں پیش کرتا ہے جہاں باغِ انجیر ہے جہاں ہابیل و قابیل کی قبریں ہیں ، جہاں یحییٰ علیہ السلام کی قبرِ شریف ہے اور بعد کے زمانے میں یزید کی قبر بھی وہیں ہے ۔ جبلِ زیتون اور اس کے اطراف ابراہیم علیہ السلام ، اسحاق علیہ السلام ، سلیمان علیہ السلام ، یعقوب علیہ السلام سب کے قبور متبرکہ ہیں ۔ طورسینین بھی ایک پیغمبر (موسٰی علیہ السلام) کے لئے اللہ کی تجلیات کی جگہ ہے ۔ مکّہ شریف میں آدم علیہ السلام ، اسماعیل علیہ السلام اور رسولِ خدا ﷺ سے یہ مقامات علاقہ رکھتے ہیں ۔ حاصل یہ کہ یہ مقامات اور ان کے رہنے والے جو پیغمبروں سے ربط رکھتے ہیں اس بات کی گواہی دیں گے : ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِـــیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ○ ثُمَّ رَدَدْنٰـــهُ اَسْفَلَ سَافِلِیْنَ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا ''۔ غرض یہ مقامات اور اس کے رہنے والے جو پیغمبروں سے علم حاصل کرچکے ہیں اس بات کی گواہی دیں گے کہ '' ہم نے انسان کو اچھا ہی پیدا کیا تھا اور بہترین طریقے سے پیدا کیا تھا مگر وہ برے کام کرکے ''اسفل السافلین'' میں پہنچ گیا ، مگر اس سے وہی لوگ مستثنٰی ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور عملِ صالح کرتے ہیں'' میں نے تمام قسموں کی وجہ اور ان کے اصل بیان سے ربط کو ظاہر کیا ہے ۔

خصوصیاتِ تفسیر

اس تفسیر کی خصوصیات حسبِ ذیل ہیں :-

(۱) قواعدِ تجوید بالاختصار مع خصوصی علامات ، آیات کے ساتھ ساتھ ظاہر کئے گئے ہیں جس کے ذریعہ بوقتِ تلاوت اصول تجوید کی پابندی کی جاسکتی ہے ۔

(۲) یہ تفسیر نہایت عام فہم سلیس اُردو میں لکھی گئی ہے اور اس میں اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے کہ خود عربی سے قرآن کو سمجھیں ، اس لئے ہر لفظ کے جُدا جُدا معنے بیان کئے جاتے ہیں ۔ ترجمہ میں اس بات کا لحاظ رکھا جاتا ہے کہ اصل میں یہ لفظ کس مادہ سے مشتق ہے مثلاً اِتَّقُوْا اللّٰہَ کے معنٰی خود کو غضبِ خدا سے بچاؤ ۔ کیونکہ '' اِتَّقُوْا '' وَقٰی یَقِیْ ، وِقَایَۃً سے ہے جس کے معنٰی '' بچانا '' کے ہیں ۔ نیز اس مادّہ سے کوئی لفظ اُردو میں مستعمل ہو تو وہ بھی بیان کردیا جاتا ہے جیسے '' اِتَّقُوْا اللّٰہَ '' کے معنٰی '' خدا سے ڈرو'' اور تقویٰ اور پرہیزگاری بھی لکھ دیئے جاتے ہیں ۔ نیز اس مادہ سے اگر کئی کلمے اُردو میں مستعمل ہیں تو وہ بھی بیان کردیئے جاتے ہیں : جیسے اِتَّقُوْا اللّٰہَ کے ساتھ وَقٰی یَقِیْ وِقَایَۃً اور متقی بھی لکھ دیا جاتا ہے ۔

(۳) اس تفسیر میں جابجا حقیقی معنٰی کے سوا اعتباری اور مجازی معنٰی بھی بیان کئے گئے ہیں ۔ واضح ہو کہ جب کسی امر کی

نسبت اصل کی طرف کی جاتی ہے تو اس کو اسنادِ حقیقی کہتے ہیں اور کسی شئے کے تعلق کی طرف نسبت کرنے کو اسنادِ مجازی ، اسنادِ مجازی کے لئے قرینہ کی ضرورت ہوتی ہے مثلاً جَرَی الْمِیْزَابُ یعنی پرنالہ بہا ، بہنے کی نسبت پانی کی طرف کرنا اسنادِ حقیقی ہے اور پرنالہ کی طرف نسبت کرنا اسنادِ مجازی ہے ، پس وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْئَۃِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْھَا فَتَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ میں تَخْلُقُ کی نسبت حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف مجازی ہے اور خدائے تعالےٰ کی طرف نسبت اسنادِ حقیقی ہے اور قرینہ لفظ بِاِذْنِیْ ہے نیز جناب عیسٰی علیہ السلام کا موحد ہونا ۔ جبرئیل علیہ السلام نے حضرت مریم علیہا السلام سے کہا : لِاَھَبَ لَکِ غُلَامًا زَکِیًّا ۔ تاکہ میں تجھے پاک بیٹا دوں ۔ بیٹا دینے کی نسبت ، جبرئیل علیہ السلام کی طرف نسبتِ مجازی ہے کیونکہ وہ فرشتے اور موحد ہونے کے سوا مامور من اللہ ہیں اور بیٹا عطا کرتے ہیں ۔ بہر حال حقیقی معنٰی سے پھیرنے والا قرینہ ہوتو وہ نسبت مجازی ہوگی ۔ کفر اور اسم کا دار و مدار اسی مسئلہ کے سمجھنے پر ہے اس لئے جابجا اس کو بیان کیا گیا ہے اور اس کی توضیح بھی کی گئی ہے ۔

(۴) اس تفسیر میں جہاں جہاں مشاکلہ ہے اس کو بھی ظاہر کیا گیا ہے ، جیسے وَمَکَرُوْا وَمَکَرَاللّٰہُ وَاللّٰہُ خَیْرُ الْمَاکِرِیْنَ میں مشاکلہ ہے معنٰی یہ ہیں کہ انھوں نے مکر کیا اور اللہ ان کے مکر کی سزا دیتا ہے اور اللہ تو بہترین مکر کی سزا دینے والا ہے ۔ اسی طرح ''اِنَّھُمْ یَکِیْدُوْنَ کَیْدًا وَّ اَکِیْدُ کَیْدًا '' کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ مکر کرتے ہیں اور ہم ان کے مکر کی سزا دیتے ہیں ، اس میں بھی مشاکلہ اور مجازی معنٰی ہیں ۔

(۵) اس تفسیر میں اگر کسی جگہ نحوی مسائل کے سمجھنے میں طالب علم کو کوئی دشواری ہوتی ہے تو وہ بھی حل کردی گئی ہے ۔

(۶) تفسیرِ صدیقی میں یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تمام تصوّف کی کتابیں اور ائمہ کے مذاہب سب قرآن سے ماخوذ ہیں اور یہ کہ ائمہ نے ایک قدم بھی قرآن کے خلاف نہیں اُٹھایا ۔ ائمہ کے اقوال قرآن کے اجمال کی تفصیل ہیں اور سب کا ماخذ قرآن ہی ہے ۔ ائمہ نے نہ اپنے دل سے کوئی مسئلہ نکالا ، نہ کسی غیر مذہب والوں سے کچھ لیا ، ائمہ ہی کیا بلکہ ہر مسلمان کا مرجع قرآن ہے ، اس سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھ لیں کہ ہمیں جو کچھ ملا ہے وہ قرآن ہی سے ملا ہے ۔ قرآن ہی یقینی اور قطعی چیز ہے ۔

(۷) اس تفسیر میں مخالفینِ اسلام کے تمام اعتراضات کے حتی الامکان جوابات دیئے گئے ہیں ۔ مثلاً جزیہ کے معنٰی ''حقِ حفاظت'' ، اور وارفنڈ بتائے گئے ہیں ۔

(۸) تفسیرِ صدیقی میں تردیدِ مذہب کے عوض اصل مسائل کی تحقیق کردی گئی ہے جس سے پڑھنے والے کے دل پر غیر مذاہب کے اعتراضات کا مطلقاً اثر نہیں ہوتا ۔ کیونکہ ممکن ہے کہ غلط اعتراض دلنشیں ہوجائے اور لاکھ نکالے نہ نکلے ۔

(۹) اس تفسیر کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ مختلف معترضین کے اعتراض ، اس انداز میں بیان کئے گئے ہیں کہ کسی کا شخصی نام ظاہر ہونے نہیں پاتا اور مسئلہ کی تحقیق ہوجاتی ہے ۔

(۱۰) اس تفسیر میں تصوّف اور علمِ اخلاق کے مسائل سہل ترین طریقہ سے بیان کردیئے گئے ہیں نیز کوشش کی گئی ہے کہ تمام مسائل قرآن کے ضمن میں معلوم ہوں جیسے سود ، دارالحرب ، سرمایہ داری ، اشتراکیت اور غلامی وغیرہ کی بھی تحقیق کردی گئی ہے ۔

(۱۱) اس تفسیر میں ایک بات کی بڑی سعی کی گئی ہے کہ ایک آیت کو دوسری آیت سے جو ربط ہے اس کو بیان کیا جائے۔ محذوفات و مقدرات بھی ظاہر کردیئے گئے ہیں ۔ نیز اس امر کو خاص طور پر ملحوظ رکھا گیا ہے کہ قرآن کو سمجھنا غیرِ قرآن پر موقوف نہیں کیونکہ وہ خود مبین ہے ۔

(۱۲) اس تفسیر کی ایک اور خصوصیت ''مسئلہ اعجازِ قرآن'' ہے جس کو نہایت تفصیل سے بیان کیا گیا ہے اور بتلایا گیا ہے کہ قرآن نہ صرف بلاغت میں اعجاز ہے بلکہ ہر اعتبار سے وہ اعجاز ہی اعجاز ہے ۔ ہر فن کا آدمی اگر قرآن کا مطالعہ کرے گا تو قرآن خود اس کے فن میں معجزہ بن کر ظاہر ہوگا ۔

(۱۳) تفسیرِ صدیقی میں بطور خاص اس بات کو ثابت کیا گیا ہے کہ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ، نیز مسئلہ نسخ کی بھی تحقیق کی گئی ہے ۔ آیت کے ایسے معنٰی بیان کئے جاتے ہیں کہ نسخ کی طرف ذہن منتقل ہی نہیں ہوتا ۔ سارا قرآن اسی ترتیب سے ہے ۔ جیسا کہ حضور نبی کریم ﷺ پر نازل ہوا تھا ۔

(۱۴) قرآن میں جہاں جہاں خدائے تعالیٰ نے قسم کھائی ہے ، اس تفسیر میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ حقیقت میں شہادت ہے اور ہر جگہ کوشش کی گئی ہے کہ وجہ شہادت کیا ہے بیان کردی جائے ۔

(۱۵) اس تفسیر کی نادر خوبی یہ ہے کہ جابجا احکامِ قرآنی کو زمانہ حال پر منطبق کرکے مسلمانوں کو سائینس اور تہذیب کے آئینہ میں ان کی صورت دکھلا دی گئی ہے ، تاکہ موجودہ دور میں کس طرح مسلمان احکامِ قرآنی سے دور ہوئے اور ہوتے جارہے ہیں وہ ان پر منکشف ہوجائے ۔

(۱۶) غرض اس تفسیر کا طرزِ بیان نہایت آسان ، دل نشین ، اور تفہیم بہت ہی خاطر نشان ہے ۔ اس سے نہ صرف عربی زبان آتی ہے ، بلکہ اُردو ادب سے بھی واقفیت ہوجاتی ہے ، اور مسائلِ قرآنی کے مقاصد اور اُصول سمجھ میں آجاتے ہیں اسلام اور اس کی حقیقت ظاہر ہوجاتی ہے ۔ اور چونکہ طرزِ بیان دل کش ہے اس لئے پڑھنے والے کا جی نہیں اُکتاتا بلکہ اس سے ایک طرح کا نشاط اور انکشاف پیدا ہوتا ہے ۔ ع

''مشک آنست کہ خود ببوید نہ کہ عطار گوید''

آخر میں اللہ تعالیٰ سے قبولیت کا اُمیدوار ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ اس تفسیر کو ہر دل عزیز بنائے اور اس سے لوگوں کو بلکہ خود مجھ کو بھی فائدہ حاصل ہو۔

اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ حَقَائِقَ الْاَشْیَآءِ کَمَا ھِیَ ۔ تَوَفَّنِیْ مُسْلِمًا وَّ الْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ ۔ اَللّٰھُمَّ اَرِنِیْ الْحَقَّ حَقًّا وَّ ارْزُقْنِیْ اتِّبَاعَهُ وَاَرِنِیْ الْبَاطَلَ بَاطِلًا وَّ ارْزُقْنِیْ اجْتِنَابَهُ ۔

اَللّٰھُمَّ اجْعَلِ الْقُرْاٰنَ رَبِیْعَ قَلْبِیْ وَجِلَآءَ حُزْنِیْ وَغَمِّیْ ۔ اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حِفْظَ الْقُرْاٰنِ وَفَھْمَهُ وَالْعَمَلَ بِهٖ وَالتَّعْلِیْمَ لِلنَّاسِ اِلٰهَ الْحَقِّ اٰمِیْنَ ۔

خادمِ قرآن

فقیر محمد عبدالقدیر صدّیقی قادری